تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس اُردو

اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا ارتقا:

تجزیاتی مطالعہ

محقق

غزل یعقوب

145-FLL/MSURDU/F14

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

TH-26827
Accession No.

MS
891.439
غ زا

اردو ادب - تاریخ و تنقید
ادب میں خواتین
اختر النساء بیگم - تنقید و تجزیہ
ادب میں نسائیت
اردو افسانہ - خواتین مصنفات - تاریخ و تنقید

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Ghazal Yaqub**

Title of the Thesis: "اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا ارتقا: تجزیاتی مطالعہ"

Registration No: 145-FLL/MSURDU/F14

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Prof. Dr. Munawar Iqbal Ahmad
Dean Faculty of Language & Literature IIUI

Chairperson Department of Urdu:

Dr. Najeeba Arif
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Shazia Sadaf
Margala College, F/7-4, Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Najeeba Arif
Associate Professor Urdu Department IIUI

Supervisor:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor Urdu Department IIUI

583

Rupees 20

۲۰ روپے

NOTARY PUBLIC
Islamabad

بیان حلفی

میں مسماۃ غزل یعقوب دختر محمد یعقوب اعوان رجسٹریشن نمبر 145-FLL/MSURD/F14، حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ میرا مقالہ بعنوان "اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا ارتقا: تجزیاتی مطالعہ" سرقے سے پاک ہے۔ اور اس مقالے میں مکمل اور اصل حوالہ جات دیے گئے ہیں۔

متذکرہ بالا بیان میرے علم و یقین کے مطابق درست ہے اور کوئی امر مخفی نہیں رکھا گیا ہے۔

Reheel Ahsan
Stamp Paper Vendor
License No. 533
Main G.T. Road, Rawalpindi

مقالہ نگار

غزل یعقوب

37405-3294125-0

13
29/11

محمد یعقوب دختر [redacted] اعوان

161 ...

راولپنڈی

37[redacted]-5

بیان حلفی برائے معاملہ

ISB

Rekeel Ahsan
Stamp-Paper Vender
License No. 533
Main G.T. Road, Rawalpindi

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ غزل یعقوب رجسٹریشن نمبر 145-FLL/MSURDU/F14 نے ایم۔ایس اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان **اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا ارتقا: تجزیاتی مطالعہ** تحقیقی مقالہ رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر

پیش لفظ

انیسویں صدی کا آغاز برعظیم میں بیک وقت بہت سی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جس سے زبان و بیان، خیالات وافکار، رہن سہن اور دیگر معاملات بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ اس کا سب سے بڑا سبب جنگ عظیم میں ناکامی اور انگریز حکام کا در آنا تھا۔ انگریزوں کی آمد ایک نئی تہذیب و ثقافت، طرز معاشرت اور زبان و بیان کے ساتھ ہوئی جس کا گہرا اثر ہندوستانی طرز معاشرت پر ہوا۔ انگریزوں کی حاکمیت سے جدید طرز معاشرت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور افکار میں واضح تغیر سامنے آیا۔ ان تبدیلیوں نے جہاں افراد کے اذہان پر اپنا نقش چھوڑا وہاں ادب بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا کیوں کہ ادب کسی بھی ادیب کے ان خیالات وافکار کا پرتو ہے جو وہ معاشرے سے اخذ کر کے اپنی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ اسی طرح اردو ادب میں بہت سے مصنفین نے وقتی تقاضوں کے مطابق اپنے اپنے انداز میں مختلف افکار و خیالات کی وضاحت کی اور بہت سے موضوعات کی تحریری پیشکش بھی کی۔ اس دوران میں جہاں معاشرہ تبدیلی سے ہمکنار ہو رہا تھا وہاں ادب میں بھی نئے رجحانات کا اضافہ ہوا جس میں اہم تبدیلی داستان کی بجائے ناول کے پیرائے میں افکار و نظریات کی عکاسی تھی۔ داستان میں جہاں فرضی قصے بیان کیے جاتے تھے ان کی جگہ حقیقی زندگی کے حالات و واقعات نے لے لی اور حقیقیت پر مبنی کردار اور ان سے متعلقہ واقعات بیان کیے جانے لگے۔ ناول نگاری کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کا نام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جنھوں نے اصلاح معاشرہ کے لیے اہم ترین خیالات کی عکاسی ناول کے پیرائے میں کی اور خاص طور پر مسائل نسواں کے حوالے سے بات کی ان کے ناولوں کے نسائی کردار اس دور کی خواتین کی مکمل تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں مرد مصنفین ناول کی صنف میں اپنے خیالات کی پیشکش کر رہے تھے وہاں خواتین نے بھی اپنے افکار کو ناول کے پیرائے میں ڈھالا۔ اس کے علاوہ دیگر ناول نگاروں میں خواتین اور مرد دونوں طرح کے مصنفین نے اپنے اپنے انداز میں مختلف النوع موضوعات کو ناول کی ہیئت میں پیش کر کے اس صنف میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ اس حوالے سے نذر سجاد حیدر اور عصمت چغتائی اہم ترین نام ہیں۔ جنھوں نے خاص طور پر خواتین کے لیے اور ان کے مسائل کے

مطابق ناول تحریر کیے جنھیں اردو ادب میں خوب پذیرائی ملی۔زیر نظر تحقیق میں نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم اور عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر کا تقابلی تجزیہ کیا گیا ہے۔اور دونوں ناولوں میں نسائی کرداروں کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھا گیا ہے کہ نذر سجاد حیدر اور عصمت چغتائی نے کس طرح خواتین کے مسائل کی تصویر کشی کی ہے۔اس تجزیے کی روشنی میں کلامیہ کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔اور یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دونوں خواتین ناول نگاروں نے پدر سری معاشرے میں رہتے ہوئے کس طرح عورت کی تصویر کشی کی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ پدر سری نظریات سے انحراف کرتی ہیں یا اس کی تقلید کرتی ہیں۔تجزیے سے فرداً فرداً دونوں ناولوں کا تجزیہ کر کے ان کا تقابلی تجزیہ بھی کیا گیا ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ دونوں مصنفین کے ہاں تصورِ عورت کیا ہے۔

مقالے کی تکمیل چار ابواب کے تحت کی گئی ہے پہلے باب میں اردو ناول کے موضوعات اور ان میں نسائی کرداروں کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔دوسرے باب میں نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم کا تجزیہ کیا گیا ہے اور نذر سجاد کے ہاں نسائی کرداروں کا ارتقا دیکھا گیا ہے۔تیسرے باب میں عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر کا تجزیہ کیا گیا ہے اور عصمت کے تصور عورت تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔اور نسائی کرداروں کا ارتقا دیکھا گیا ہے۔ چوتھے باب میں دونوں ناولوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے دونوں مصنفین کے نظریات کا تقابل کیا گیا ہے اور ان کے افتراقات و مماثلتیں دیکھی گئی ہیں اور نسائی کرداروں کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور دونوں ناولوں میں سماجی، معاشی اور ثقافتی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔آخر میں دونوں ناولوں کے تقابل سے حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں سفارشات پیش کی گئی ہیں۔

سب سے پہلے میری محترم استاد اور مقالے کی نگران ڈاکٹر حمیرا اشفاق کا شکریہ مجھ پر واجب ہے،ان کی رہنمائی کے بنا یہ کام کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔میڈم کے مفید مشوروں اور ہم وقت تعاون کی وجہ سے یہ مقالہ تکمیل تک پہنچا۔میڈم کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ان کا وجود میرے لیے مشعل راہ ہے۔زندگی کے اتار چڑھاؤ سے لے کر علمی و تدریسی سرگرمیوں تک وہ ہمیشہ میری رہنما رہی ہیں۔وہ بہترین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل استاد بھی ہیں۔اللہ ان کے علم میں مزید اضافہ فرمائے تاکہ وہ علم کے پیاسوں کی آبیاری یوں ہی کرتی رہیں۔

اردو کے ابتدائی ناولوں میں نسائی کرداروں کا ارتقا پرکھنے کے لیے ان تمام ناولوں تک رسائی بہت ضروری تھی۔اسی طرح نذر سجاد حیدر اوائل بیسویں صدی کی ممتاز ناول نگار خاتون ہیں جن کی تصانیف تک رسائی آسان نہیں تھی اور ان کی بیشتر تحریریں آسانی سے میسر نہ تھی۔اس حوالے سے میں ساؤتھ ایشین ریسرچ اینڈ ریسورس سینٹر کے بانی سر احمد سلیم کی بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی کڑی مصروفیات کے باوجود میرے لیے وقت نکالا اور

علم کے ذخیرے سے فیض یاب ہونے کا موقع دیتے ہوئے میرے لیے مواد تک رسائی آسان بنائی۔

اس کے ساتھ ساتھ شعبہ کی صدر اور میری محترم استاد ڈاکٹر نجیبہ عارف کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے جلد از جلد اپنا مقالہ مکمل کرنے کی ترغیب دی اور انتظامی سرگرمیوں میں برتی جانے والی کوتاہیوں کو نظر انداز کیا۔ میرے دیگر اساتذہ ڈاکٹر صباحت مشتاق، ڈاکٹر شیر از فضل داد کا بھی شکریہ جو اکثر میری حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ مس اسماعزیز اور مس عاصمہ نذیر کا خصوصی شکریہ جنھوں نے مقالے کی ترتیب سے لے کر تکمیل تک کے مراحل میں میری معاونت کی۔ ماریہ ترمذی نے حوالوں کو شکاگو مینول کے تحت ترتیب دینے میں معانت کرتے ہوئے میری مشکل آسان کر دی ان کے لیے نیک تمنائیں۔

پیاری دوست ڈاکٹر غلام فریدہ کا تہ دل سے شکریہ کہ انھوں نے وقت کی قلت، تدریسی اور انتظامی امور کی انجام دہی کے باوجود ہر مرحلے پر رہنمائی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ موضوع کے انتخاب سے لے کر خاکے کی تیاری تک فرح انصاری کا تعاون میرے ساتھ رہا ان کا خصوصی شکریہ کہ مجھے مفید مشوروں سے نوازا اور موضوع کے انتخاب کے مشکل مرحلے میں میری رہنمائی کی۔ یوں تو دوستوں کو شکریہ کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ وہ تمام معاونت ذمہ داری کے طور پر کر رہے ہوتے ہیں لیکن پھر قریبی دوستوں کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مقالے کی تبئیض و تسوید میں میری مدد کی۔

پیاری بیٹی تقدیس کے لیے محبتیں اور ڈھیروں دعائیں اس اعتراف کے ساتھ کہ ایم ایس میں داخلے سے لے کر مقالے کی تکمیل تک کے مراحل میں وہ بہت نظر انداز ہوئی لیکن میری ساس (جن کے ساتھ ساس لفظ بالکل نہیں جچتا) نے میری کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی اور ۲ا دن کی بیٹی کی تربیت کو اپنے ذمے لے کر میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔۔۔ایم ایس کی تکمیل ان کی معاونت کے بنا کبھی بھی ممکن نہیں تھی۔ ان کے لیے پیار اور احترام۔۔۔ میرے رفیق حیات ذوالکیف علی کا تعاون بھی ہمہ وقت میرے ساتھ رہا۔ ان کا خصوصی شکریہ کہ انھوں نے میرے تعلیمی سفر میں میرا بھرپور ساتھ دیا اور یہ حوصلہ دیا کہ میں یہ کام کر سکتی ہوں۔ گھر کے دیگر افراد پاپا، امی، تایا ابو، سعود، ثانیہ (جس کی معصوم دعاؤں نے سب مشکلیں آسان کر دی)، عینی اور جبران کا شکریہ کہ جنھوں نے تھیسس کی تاخیر کے تمام حالات و واقعات کو تحمل سے سنا اور الجھنوں کو کم کرنے کی کوشش کی۔ پاپا نے کبھی پیار سے اور کبھی تھوڑا سا ڈپٹ کر کام جلدی مکمل کرنے کی ترغیب دی۔ زندگی کے دیگر مراحل کی طرح علمی مراحل میں بھی پاپا نے ہمیشہ مجھے ہمت اور حوصلہ دیا اور مثبت انداز میں کام کرنے کی ترغیب دی۔ پاپا اور امی کا شکریہ کبھی الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا انھوں نے مجھے زندگی کی تلخیوں کا سامنا ثابت قدمی سے کرنے کا ہنر سکھایا۔ پاپا نے مشکل وقت میں ثابت قدم رہنا اور امی نے ہمت اور حوصلے

سے مشکلات سے لڑنا سکھایا۔ان کے لیے تمام محبتیں اور نیک تمنائیں۔۔۔کہ میں جو بھی ہوں ان سے ہوں۔

اللہ رب العزت کا جتنا شکر کروں کم ہے کہ اس نے میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے لیے اتنے محسن منتخب کر دیے اور مجھے اپنی رحمتوں کے حصار میں رکھا۔

غزل یعقوب

۳۰نومبر ۲۰۱۷

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	تصدیق نامہ	
	بیان حلفی	
	پیش لفظ	
	فہرست ابواب	
۱	باب اول: اردو ناول میں نسائی کرداروں کا ارتقا	۱
۲	باب دوم: نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم میں نسائی کرداروں کا ارتقا	۱۹
	۱۔ تعلیم نسواں کی اہمیت	
	۲۔ لڑکیوں کی تعلیم میں رکاوٹ: معاشرہ	
	۳۔ پڑھے لکھے اور ان پڑھ کردار میں افتراقات اور ان کی خصوصیات	
	۴۔ اصلاح معاشرہ	
	۱.۴۔ صغر سنی کی منگنی کی مخالفت	
	۲.۴۔ شادی کے معاملات میں لڑکی اور لڑکے کی پسند	

۴.۳۔ شادی پر کی جانے والی فضول رسومات

۴.۴۔ نتھ کا رواج

۴.۵۔ جہیز

۴.٦۔ بچے کی پیدائش پر کی جانے والی رسمیں

۴.۷۔ بیٹے کی پیدائش پر خوشی اور بیٹی کی پیدائش پر غم

۴.۸۔ خاندان کا وارث: بیٹا

۴.۹۔ بیوہ کے مسائل

۴.۱۰۔ دوسری شادی کی مخالفت

۴.۱۱۔ پردے کی بحث

۵۔ قدیم اور جدید رویوں کا تصادم

۳ باب سوم: عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا ارتقا ۵۲

۱۔ نفسیاتی کشمکش

۲۔ جنسی بے راہ روی

۳۔ شخصیت کی تعمیر اور معاشرتی عوامل

۴۔ تصور عورت

۵۔ روایت سے انحراف

۶۔ معاشرے کی عکاسی

۴ باب چہارم: اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا تقابلی مطالعہ ۹۱

۱۔ تصور عورت

۲۔ سماجی حیثیت

۳۔ فیصلے کا اختیار

۴۔ معاشرے کی عکاسی

ماحصل

کتابیات

بسم الله الرحمن الرحيم

بابِ اوّل:

اردو ناول میں نسائی کرداروں کا ارتقا

باب اول:

اردو ناول میں نسائی کرداروں کا ارتقا

انیسویں صدی زبان وادب، خیالات وافکار، طرز معاشرت اور دیگر امور زندگی میں بڑی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ جس کی بڑی وجہ جنگ آزادی میں ناکامی کے ساتھ ساتھ انگریزوں کا حکمران ہونا اور ہندوستانی سرزمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لینا تھا۔ انگریزوں کی آمد ایک نئی تہذیب وثقافت، طرز معاشرت اور زبان وبیان کے ساتھ ہوئی جس کا گہرا اثر ہندوستانی قلوب واذہان پر ہوا۔ انگریزوں کی حاکمیت سے جدید طرز معاشرت کے ساتھ ساتھ زبان وبیان اور افکار میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں نے قلوب وافراد کے اذہان کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی گہرے اثرات چھوڑے۔ ادب کسی بھی ادیب کے ان خیالات وافکار کا پرتو ہوتا ہے جو وہ معاشرے سے اخذ کر کے اپنی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ اسی طرح اردو ادب میں بہت سے مصنفین نے وقتی تقاضوں کے مطابق اپنے اپنے انداز میں مختلف افکار وخیالات کی پیشکش کی اور بہت سے موضوعات کو داخل دفتر کیا۔

اس دوران میں جہاں معاشرہ تبدیلی سے ہمکنار ہو رہا تھا ادب میں بھی خاطر خواہ اضافے اور تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان میں ایک اہم تبدیلی داستان کی بجائے ناول کی صنف میں اپنے خیالات وافکار کی پیشکش تھی۔ داستان میں جہاں فرضی قصے بیان کیے جاتے تھے ناول میں ان کی جگہ حقیقی زندگی کے حالات وواقعات نے لے لی۔ اور حقیقت پر مبنی کردار اور ان سے متعلقہ واقعات بیان کیے جانے لگے۔

ادب چاہے نظم ہو یا نثر عورت ہمیشہ اس کا مرکزی موضوع رہی ہے۔ ابتدائی مثنویوں سے لے کر داستانوں تک کے ادب میں بے شمار نسائی کردار ملتے ہیں، جن کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے، جب کہ بعض کردار مرکزی کردار کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ کہیں عورت سراپا وفا ہے تو کہیں مجسم، حسن اپنی اداؤں سے ہیرو کا دل جیتنے کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے لیکن کہیں بھی عورت کی ذہانت اور اس کے شعور کو نہیں سراہا گیا۔ اسے محض جسم تک

محدود رکھا گیا جس کا مقصد اپنے حسن کی طاقت سے مرد کو خوش کرنا ہے۔ ہر صنف میں نسائی کرداروں کی پیشکش مختلف انداز میں کی گئی ہے کہیں مدر سری معاشرے کے زیر اثر تو کہیں پدر سری نظام میں الجھی عورت ادب کی زینت بنتی رہی۔

اردو کی ابتدائی مثنویوں میں دیکھا جائے تو نسائی کردار مردوں کو لبھانے اور ان کے لیے تفریح پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں اور اس سے بڑھ کر ان کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ یہی صورت داستانوں میں ملتی ہے جن کے نسائی کردار سراپا حسن و ادا ہیں اور داستان کا ہیرو محض اس حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے تمام مصائب و مشکلات برداشت کرتا نظر آتا ہے۔ عورت کا مقصد ہمیشہ سے مرد کے لیے تفریح اور خوشی کا سامان پیدا کرنا ہے۔ اردو داستانوں میں نسائی کرداروں کا جائزہ لیا جائے تو عورت محض سراپا حسن و خوبصورتی ہے جو زندگی کی حقیقتوں سے ماورا بادشاہ زادی ہونے کے ناطے عیش عشرت میں گم، کنیزوں کے درمیان اپنے شہزادے کے انتظار میں مگن ہے۔ اس کے شعور کے حوالے سے کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ بعد ازاں اردو ناول کے نسائی کرداروں کا مطالعہ کیا جائے تو صورتحال قطعاً مختلف نظر آتی ہے اردو ناول کی عورت مذہب اور معاشرے میں الجھی ہوئی، گھر گرہستی سنبھالتی، اچھی یا بری عورت بننے کے چکر میں الجھی دکھائی گئی ہے۔ جسے زندگی کا بسر بھی معاشرے کے اصول و قواعد کو مد نظر رکھتے ہوئے کرنا پڑتا ہے۔ جسے محض چار دیواری میں رہتے ہوئے مطمئن رہنا ہے۔ تمام علوم و فنون تک رسائی اس کے لیے منع ہے۔ اس کا مقصد حیات محض مرد کی تفنن طبع ہے اس کے علاوہ اس کا اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور اس تمام کشت کے باوجود اچھے یا برے ہونے کی سند بھی مرد اور معاشرے نے ہی عطا کرنی ہے۔ ادب میں نسائی کرداروں کی پیشکش کے حوالے سے ڈاکٹر حمیرا اشفاق یوں رقمطراز ہیں:

"۔۔۔عورت کو اس کے وجود کو اور اس کے شعور کو الگ الگ دیکھا گیا۔ یعنی اگر وجود کا ذکر کریں تو شعرا کے دیوان بھرے نظر آتے ہیں، اس کی سراپا نگاری پر، مگر اس کے شعور کی تلاش میں نکلیں تو ادب میں اس کو سراہنا تو در کنار اس کا ذکر تک نہیں ملتا"(۱)

اسی طرح بادشاہ منیر بخاری اردو ادب میں عورت کی تصویر کشی کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

"عورت کو بحیثیت ادیب شاید کسی ادیب نے دیکھا ہی نہیں۔ جہاں بھی اردو ادب میں عورت نظر آئی وہ کسی اور حیثیت میں ملے گی۔ کہیں وہ محبوبہ کی صورت میں، کہیں بیوی، کہیں طوائف، کہیں ساس، کہیں بہو غرض معاشرتی زندگی میں عورت کو بحیثیت شے کے پیش کرنے کا رجحان ہی رہا ہے۔"(۲)

اس کے ساتھ ساتھ اسی معاشرے میں رہتے ہوئے ایک ایسی عورت کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو انتہائی

مضبوط ہے۔ یہ عورت کوئی عام عورت نہیں بل کہ ایک طوائف ہے جو مردوں کو اپنے حصار میں لیے ہے۔ عام عورت کے مقابلے میں اتنی مضبوط ہے کہ ہر طبقے کے مردوں پر غلبہ پا رکھا ہے اور شرفا اپنے بچوں کی تربیت کے لیے اسی سے رجوع کرتے ہیں۔ اس دور کے سماجی حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو اس پیشکش کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ دور چونکہ ہندوستانی معاشرے کے لیے سازگار نہیں تھا۔ ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں نے جدید تعلیم و ترقی کے در خود پر بند کر لیے تھے بہت کم گھرانے ایسے تھے جو تعلیم کی طرف توجہ دے رہے تھے۔ اس دور میں جہاں مرد معاشرتی جکڑبندیوں میں الجھا ہوا تھا وہاں عورت کا گھر سے نکلنا تک معیوب گردانہ جاتا تھا۔ اور اس کا گھر کی چار دیواری میں رہنا ہی اچھا تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آواز کا بھی چار دیواری سے باہر جانا معیوب تھا اور خواتین کے نام بھی مردوں کے ناموں پر رکھے جاتے تھے تاکہ نام تک کا پردہ رکھا جا سکے۔ اس دور میں مختلف علما اور مصنفین نے معاشرتی تربیت کے لیے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا جس میں عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دلائی گئی۔ جو بعد ازاں ایک تحریک کی صورت میں ابھری اور اپنے گہرے نقش چھوڑ گئی۔ جس سے متاثر ہو کر بعد کے کئی مصنفین نے اصلاح معاشرہ کے حوالے سے تحریریں لکھیں۔ اس دور میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین مصنفین بھی ابھریں لیکن معاشرتی حد بندیوں کی وجہ سے وہ اپنا نام استعمال نہ کر سکیں اور مردوں کے فرضی ناموں سے تصنیف کرتی رہیں۔ ادب میں معاشرے کی اصلاح کے حوالے سے بہت سے مضامین کا اضافہ ہوا جس کی عملی صورت ناول میں ملتی ہے۔ ناول چونکہ فرد کی حقیقی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہوتا ہے اس لیے اس دور میں بہت سے ناول تصنیف کیے گئے۔

اس سے پہلے خواتین کی تعلیم و ترقی کو معیوب سمجھا جاتا تھا اسی لیے ان کے لیے خاص انتظامات نہیں کیے گئے لیکن وقتی ضروریات اور بدلتے رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس امر کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی جانے لگی کہ خواتین کو گھر کی چار دیواری میں مقید رکھنے سے معاشرہ مزید پستی کی جانب گامزن ہو جائے گا۔ اس لیے مختلف افراد نے مختلف نوعیت کی کوششوں سے خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے مناسب اقدامات کیے۔ جن میں خواتین کے لیے ایسے رسائل کا اجرا کیا گیا جو ان کی بنیادی تعلیم و آگہی کے لیے مددگار ثابت ہو سکیں اس کے لیے بہت سے مرد اور خواتین مصنفین نے اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا ادب تخلیق کرنا شروع کیا جو خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے مفید ہو۔ مختلف مصنفین نے نظم، نثر مضمون، سفر نامے اور دیگر اصناف سخن میں اپنے اپنے خیالات کی عکاسی کی اسی سلسلے کی ایک کڑی ناول ہے۔

ناول نگاری کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کا نام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے جنھوں نے اصلاح معاشرہ بالخصوص اصلاح نسواں کے لیے اپنے نظریات ناول کے پیرائے میں پیش کیے اور خاص طور پر عورت اور اس کی تعلیم و

ترقی کے حوالے سے بات کی۔انھوں نے مراۃالعروس (۱۸۶۹ء)میں خواتین کی تعلیم کے لیےایک خاص انداز میں اپنے نظریات پیش کیے۔ جس سے ان کے افکار و خیالات کو زمانے کے وضع کردہ اصول و ضوابط کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔انھوں نے سماجی مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا حل خواتین کی تعلیم و تربیت تجویز کیا۔ نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔انھوں نے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم کی پرزور حمایت کی ہے۔ناول میں خواتین کی تعلیم کی ضرورت و اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے اور اکبری اور اصغری جیسے مثالی کرداروں کی پیشکش سے نظریات کی تشکیل کی ہے۔نذیر احمد نے تعلیم نسواں بھرپور حمایت کی ہے لیکن دوسری طرف وہ اسے مرد کے تابع ہی رکھنا چاہتے ہیں وہ یہ نہیں چاہتے کہ عورت مرد کے برابر کھڑی ہو وہ اسے ہمیشہ نیچا ہی سمجھتے ہیں اس کی مثالیں درج ذیل جملوں میں ملتی ہیں:

"پس عورت کو پیدا کرنا مرد کی خوش دلی کے واسطے تھا اور عورت کا فرض ہے مرد کو خوش رکھنا"(۳)

نذیر احمد عورتوں کی تعلیم و ترقی کے حامی تو تھے ہی لیکن ان کے ہاں بھی عورت مرد کی تابعدار ہی دکھائی گئی ہے۔ جس کا فرض مرد کی خوشی کا سامان بہم پہنچانا ہے۔اور مرد کو اس سے بالاتر قرار دیا گیا ہے اس کی ایک مثال ذیل میں ہے:

"بڑی نادانی ہے اگر بی بی میاں کو برابر کے درجے میں سمجھے۔۔۔۔۔مردوں کو خدا نے شیر بنایا ہے"(۴)

اسی طرح عورت کے مصرف کو بیان کرتے ہوئے نذیر احمد لکھتے ہیں کہ "آسان ترکیب ان کو زیر کرنے کی خوشامد اور تابعداری ہے"(۵)یعنی عورت کا مقصد محض مرد کی تابعداری ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

ناول میں اکبری اور اصغری دو کردار وہی روایتی تصور عورت پیش کرتے ہیں جو عوت کو اچھائی اور برائی کے چکر میں الجھائے رکھتے ہیں لیکن اکبری کا کردار جو ناول میں بظاہر تو منفی کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن اپنے افعال و کردار سے اردو ناول کے ان نسائی کرداروں میں شمار کیا جاتا ہے جو ارتقا پزیر ہیں اور معاشرتی جکڑ بندیوں سے قطع نظر اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کی خواہشمند ہیں۔ جنھیں بعد ازاں معاشرتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ناول کی اصل ہیروئین اصغری ہے، جو اس دور کے طے شدہ ضوابط پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دوسروں اور خاص کر اپنے شوہر کی مسرت کی کوششوں میں غرق اپنی ذات سے بے نیاز ہے۔نذیر احمد نے مراۃ العروس کے علاوہ توبۃ النصوح،ابن الوقت،بنات النعش،اور فسانہ مبتلا کے عنوان سے ناول لکھے۔ جن میں ہندوستانی معاشرے کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ بعد ازاں ڈپٹی نذیر احمد کی تقلید میں حالی اور نواب محسن الملک نے تعلیم نسواں کی

حمایت کی۔ حالی کا مجالس النسـاء اسی سلسلے کا ایک قصہ نما ناول ہے۔(۶)" حالی عورت کو انسانیت کے درجے پر رکھنے کے قائل تھے، انھوں نے اپنی تحریروں میں اس کی اہمیت کا واضح اظہار کیا ہے۔ بقول صالحہ صدیقی:

"حالی عورت کو انسانیت کا بلند ترین مقام عطا کرتے ہیں۔ وہ ایک عورت کی تعلیم و تربیت کے ساتھ عورت کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں اور ہنر مندی کو بھی بہت اہم مانتے تھے۔ خصوصاً اس بات پر کہ عورتوں کے لیے بعض اوقات یہ علم سے زیادہ سود مند ثابت ہوتا ہے"(۷)

اس دور میں خواتین کی تعلیم و ترقی سے زیادہ ان کی اصلاح کی طرف توجہ دی گئی۔ اس لیے اس دور میں اصلاحی ناول بھی تحریر کیے گئے تاکہ انھیں آگہی و شعور دیا جا سکے۔ اس سلسلے میں کریم الدین کا ناول تعلیم النسا(۱۸۷۴) تعلیم نسواں کے حوالے سے، شاد عظیم آبادی کا ناول صورت الخیال(۱۸۷۶) معاشرے کے اصلاحی پہلو کے حوالے سے اور سرشار کا ناول فسانہ آزاد(۱۸۷۹) معاشرتی مسائل کی عکاسی کے حوالے سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ فسانہ آزاد میں تعلیم نسواں کی اہمیت کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"عورت اگر تربیت یافتہ ہوگی تو اپنے بچوں کو ابتدا سے ہی عمدہ تعلیم دے سکے گی، اخلاق سکھائے گی، اچھی اچھی باتیں بتائے گی، کیونکہ دس بارہ برس تک بچے کنار مادر میں پرورش پاتے ہیں۔ اگر ماں تعلیم یافتہ ہوئی تو اوائل عمر ہی میں جس قدر عمدہ تعلیم لڑکے اس سے پا سکتے ہیں اس قدر اور کسی طرز پر ممکن نہیں"(۸)

خواتین کی تعلیمی ترقی کے حوالے سے محض مرد ناول نگاروں نے کام نہیں کیا بل کہ بہت سی خواتین ناول نگار بھی اپنے اپنے افکار و خیالات کی عکاسی اس صنف میں کرتی رہی۔ جن میں سب سے پہلے رشیدۃ النسا بیگم نے اس حوالے سے عملی کوشش کی۔ "انھوں نے اپنے ناول اصلاح النسـاء(۱۸۸۱ء) میں اصلاح و تعلیم نسواں کی عملی کوشش کی۔"(۹) رشیدۃ النسا اردو کی پہلی ناول نگار خاتون ہیں جنھوں نے اصلاح النسا کے نام سے ناول تحریر کیا۔ جس میں خواتین کی تعلیمی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوششیں کی گئیں۔

"رشیدۃ النسا سماج سے بغاوت کرتی ہیں اور جس زمانے میں عورتوں کا لکھنا تو دور کی بات ہے، پڑھنا بھی جرم تھا، اسی دور میں کوئی مذہبی قصہ نہیں، جیتے جاگتے انسانوں کی کہانی لکھنے کے لیے قلم اٹھاتی ہیں، اصلاح معاشرہ ان کا عزم ہے، تعلیم نسواں پر وہ اصرار کرتی ہیں، انگریزی سیکھنے اور سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ایک طرف آزاد خیالی کا یہ عالم ہے دوسری طرف سماج کی اتنی تابعدار ہیں کہ اصلاح النسـاء کے مسودے پر گیارہ برس تک گرد جمتی رہتی ہے اور جب وہ ان کے ولایت پلٹ بیٹے کی خواہش پر شائع بھی ہوتی ہے تو اس پر اپنا نام نہیں چھپواتیں اور "والدہ بیرسٹر سلیمان بار ایٹ لا" کی چلمن کے پیچھے رہنے میں عافیت سمجھتی ہیں"(۱۰)

ناول کی تصنیف خاص مقصد کے تحت کی گئی ہے۔ جس میں عورت کی تعلیم کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول میں معاشرتی اعتبار سے تعلیم یافتہ عورت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں پڑھی لکھی عورت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ رشیدۃ النسا ناول کی تصنیف کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ :

"۔۔۔اور قوموں میں جیسی عورت ویسے مرد، دونوں ایک ہی طور کے ہوتے ہیں۔ میاں بھی جاہل، بی بی بھی جاہل۔۔۔اور شریف امیروں کا یہ حال ہے کہ میاں پڑھے لکھے، بی بی جاہل، بے تعلیم، بے ہنر، بی بی نے شیخ سدو کا بکرا کرنا چاہا تو میاں نے منع کیا۔۔۔بی بی نے یہ تعلیم تو کبھی پائی نہیں تھی کہ شوہر کی اطاعت بی بی پر واجب ہے۔ اپنے گھر میں کبھی اس غریب نے یہ بیان نہ سنا اور نہ دیکھا تھا۔۔۔۔ مجھ کو بھی خیال ہوا کہ ایک کتاب ایسی لکھیں جن میں ان رسموں کا بیان ہو جن کے باعث صدہا گھر تباہ ہو گئے، اور جو باعث فضول خرچ اور فساد کے ہیں، مگر مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ ان باتوں کو قصہ کے پیرایہ میں لکھنا ہر طرح سے مناسب ہوگا، یہ سوچ کر میں نے ان ہی کاموں اور جھگڑوں کو جو روزانہ ہر وقت ہر شریف خاندان میں ہوتے ہیں فرضی نام رکھ کر لکھنا شروع کیا"(۱۱)

خواتین کی تعلیم و ترقی کے ساتھ اس کا مقصد "مسلمان گھرانوں میں در آنے والی لغو رسومات اور توہمات کا انسداد تھا"(۱۲) رشیدۃ النسا نے ناول میں خواتین کی معاشرتی زندگی کے حوالے سے پائے جانے والے مسائل اور ان کی خامیوں کو خاص طور پر ناول کا حصہ بنایا ہے۔ یہ ناول معاشرتی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں پائی جانے والی فرسودہ رسوم کا آئینہ دار بھی ہے۔

اردو ناول نگاری کی صف میں ایک اور اہم نام محمدی بیگم کا ہے انھوں نے اپنے ناولوں میں خواتین کی تعلیم و ترقی جیسے موضوعات کو پیش کیا اس ناول میں بھی زیادہ غالب رجحان اصلاح نسواں کا ہے۔ محمدی بیگم نے صفیہ بیگم (۱۹۰۳ء)، شریف بیٹی (۱۹۰۸ء) اور آج کل کے نام سے ناول تحریر کیے۔ محمدی بیگم کی ہم عصر اکبری بیگم نے بھی اپنی نوعیت کی کوشش کی اور گلدستہ محبت، گودڑ کا لال (۱۹۰۷ء) کے نام سے ناول تحریر کیے۔ "اس دور میں خواتین کو اتنی آزادی حاصل نہیں تھی کہ وہ اپنے اصلی نام سے کوئی بھی تحریر چھپوا سکیں اس لیے اکبری بیگم نے بھی اپنے ناول گلدستہ محبت کو عباس مرتضیٰ کے فرضی نام سے چھپوایا"(۱۳) اکبری بیگم نے بھی مسائل تعلیم نسواں اور ان کی سماجی و گھریلو زندگی کو بہتر بنانے کی کوششیں تحریری صورت میں کیں۔ ان کا ناول گودڑ کا لال اس حوالے سے اہم نمونہ ہے۔ جس میں انھوں نے عورت کی سماجی حیثیت کے استحکام کے لیے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ جو پہلی مرتبہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ ناول کا مرکزی کردار ثریا جبیں ہے جو ایک اہم نسائی کردار ہے۔ ثریا نے اس دور میں جب خواتین گھر سے نہیں نکل پاتی تھیں، نا صرف تعلیم حاصل کی بل کہ مخلوط تعلیم حاصل کر کے

ڈاکٹر کی ڈگری لی۔ ناول میں ایک عام متوسط گھر کے حالات وواقعات بیان کیے گئے ہیں اور پردے کے معاملات کو بھی بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ پردہ چونکہ اس دور کی خواتین کی تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا،اسی لیے اکبری بیگم نے ثریا کے ذریعے ایک ایسے کردار کی تشکیل کی ہے جو بنا پردے کے مردوں کے شانہ بشانہ حصول علم پر معمور ہے اور اس پر کوئی برا اثر بھی نہیں پڑتا۔اس حوالے سے ڈاکٹر حمیرا اسعید یوں رقمطراز ہیں:

''ناول کی ترقی پسندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ناول میں پردے کی قیود کے خلاف نا صرف آواز اٹھائی گئی بل کہ پہلی بار مسلم لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا تصور ملتا ہے۔اس ناول کی ہیروئن ثریا جبین بغیر نقاب کے لڑکوں کے ساتھ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔(۱۴)

ثریا جبیں اس دور کے کرداروں میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے وہ نا صرف اپنے لیے تعلیم کی راہ ہموار کرتی ہے بل کہ مردوں کے شانہ بشانہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے پدر سری نظام کی بیخ کنی کرتی ہے۔ یہاں ایک اہم کردار حسن رضا کا بھی ہے، جو اپنی بہن کو اس کے مقام تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ ہندوستانی معاشرے میں رہتے ہوئے اس میں سے مکمل طور پر نکلنا آسان نہیں یہی صور تحال ناول میں پیش کی گئی ہے۔ ثریا جبیں تعلیم کے بعد جب شادی سے انکار کر دیتی ہے تو اسے شادی کے لیے محض اس لیے رضامند کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں یہ تصور پروان نہ چڑھنے پائے کہ تعلیم کی وجہ سے عورت خود کو ممتاز سمجھنا شروع ہو گئی ہے اور کوئی اسے اپنے شایان شان نہیں ملتا۔اس کی وضاحت ان سطور میں ملتی ہے:

"آپ کو یہ نظیر نہیں قائم کرنا چاہیے کہ دنیا کہے کہ فلاں خاتون کے زیادہ تعلیم پانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اپنے قابل ہی کوئی نظر نہ آیا۔اور وہ تمام عمر اپنی تعلیم کے غرور میں بن بیاہی رہی۔آپ یہ نظیر قائم کریں کہ لوگوں کو اپنی مستورات کو تعلیم دلوانے کا شوق پیدا ہو اور کہیں کہ ان کے زیادہ تعلیم پانے کا کیا اچھا نتیجہ نکلا اور کس خوبی سے ان کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔"(۱۵)

گودڑ کا لال میں ثریا ایسے نسائی کردار کے طور پر ابھری ہے جو پدر سری معاشرے سے انحراف کرتے ہوئے اپنی منزل کا انتخاب خود کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کچھ معاملات میں اس لیے بھی مجبور ہے تاکہ آئندہ آنے والی لڑکیوں کے لیے اس کا کوئی بھی قدم نقصان دہ نہ ہو اور ان کی تعلیمی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔

اسی سلسلے کا اہم نام عباسی بیگم ہے۔انھوں نے اپنے افکار کا اظہار اپنے ناولوں افسانہ نادر جہاں اور زہرہ بیگم میں کیا۔طیبہ بیگم نے حشمت النساء اور انوری بیگم کے نام سے دو ناول لکھے۔ صغرا ہمایوں مرزا اردو کی ناول نگار خواتین کی صف کا ایک اہم ترین نام ہیں۔انھوں نے خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے اپنے خیالات

وافکار کی ترسیل تحریر النساء،موہنی،مشیر نسواں،زہرہ اور سرگزشت ہاجرہ جیسے ناولوں میں کی۔سرگزشت ہاجرہ صغرا ہمایوں مرزا کا نمایاں ناول ہے۔جس میں ان تمام مسائل کی عکاسی کی گئی ہے جو اس دور میں عام تھے۔جن میں پردہ،ازدواجی زندگی،انجان شخص سے شادی،تعدد ازدواج،بیوہ کی دوسری شادی،اور تعلیم و تربیت کے موضوعات سر فہرست ہیں۔ناول میں شادی سے متعلق معاملات کو بطور خاص بیان کیا گیا ہے۔جس میں لڑکی پر لگائی جانے والی پابندیاں قابل ذکر ہیں۔ناول میں ہاجرہ کا کردار اہم نسائی کردار ہے جو معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتی ہے اور عورتوں میں یہ شعور پیدا کرنا چاہتی ہے کہ عورت کے لیے زندگی کا حلقہ اتنا تنگ نہیں ہے جتنا اس کے لیے کر دیا جاتا ہے۔وہ معاشرے کا سب سے اہم اور فعال رکن ہے اس کے وجود کے بنا معاشرہ مستحکم نہیں رہ سکتا۔اس حوالے سے ہاجرہ یوں کہتی ہے:

> "۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد کو ہم حقیر جانتے ہیں حالانکہ ہمارے سب سے ان کی عزت ہے،ہمارے سب ان کی آبرو ہے،ہمارے سب سے ان کا وجود ہے۔۔۔"(١٦)

ناول میں مصنفہ نے عورت کو اس کی اہمیت دلانے کی کوشش کی ہے اور وہ عورت کی اہمیت کی وضاحت ان الفاظ میں کرتی ہیں "بے باپ کا بچہ پیدا ہوا ہے۔لیکن بے ماں کا بچہ آج تک پیدا نہیں ہوا(١٧)اسی طرح ناول کے مرکزی کردار کے حوالے سے ڈاکٹر حمیرا سعید یوں رقمطراز ہیں:

> "صغرا نے ہاجرہ کے روپ میں اس عورت کو پیش کیا جو اخلاقی طور پر بلند ہے اپنے عقل و فہم سے زندگی کو کامیاب بناتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ خواتین کی حالت میں سدھار لانا چاہتی ہے"(١٨)

صغرا ہمایوں مرزا کا ایک اور اہم ناول مشیر نسواں ہے۔جس میں زہرا ایک نمایاں نسائی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔"ابتدائی ناول نگاری کے عبوری دور میں صغرا ہمایوں مرزا نے زہرا کے کردار کو نہایت ہی progressive کردار کی شکل میں پیش کیا ہے۔جس میں قدیم و جدید تہذیب کا یک خوبصورت امتزاج ہے۔"(١٩)زہرا مسلم خواتین کی زندگی میں تبدیلی لانا چاہتی ہے اور ان کی ناگفتہ بہ حالت کو سدھارنا چاہتی ہے تاکہ معاشرہ بہتری کی طرف گامزن ہو سکے۔

نذر سجاد حیدر اپنے عہد کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ان کی تحریروں میں جدید رجحانات کی عکاسی ملتی ہے انھوں نے اختر النساء بیگم،آہ مظلوماں،دکھ بھری کہانی،جاں باز،نجمہ،حرماں نصیب،مذہب اور عشق اور ثریا وغیرہم میں اپنے نظریات کی پیشکش کی ہے۔اختر النساء بیگم نذر سجاد کا پہلا ناول ہے۔جس میں انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں عورت کی تعلیم و ترقی کی راہیں ہموار کرنے کی

کوشش کی ہے ناول میں نذر سجاد حیدر نے ازدواجی زندگی سے متعلقہ مسائل اور تعلیم کے ذریعے ان کا سدباب جیسے موضوعات کو بیان کیا۔ ناول کا مرکزی کردار اختر النسا بیگم ہے جو اپنی سوتیلی ماں کے ہاتھوں ظلم سہنے پر مجبور ہے اور زندگی کے معاملات اور مشکلات کے ساتھ نبٹ رہی ہے۔ لیکن آخر میں وہ ان تمام مسائل پر اپنی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے قابو پا لیتی ہے۔ ان کا ایک اور اہم ناول آہ مظلوماں ہے۔ جو ہندوستان کے متوسط طبقے کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ناول میں دوسری شادی کی وجہ سے جنم لینے والے مسائل کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ نذر سجاد کا ایک اور اہم ناول جاں باز ہے۔ جس میں وطن پرستی کو موضوع بنایا گیا ہے، یہ ناول عصمت میں قسط وار چھپتا رہا(۲۰) اپنے ناول نجمہ میں نذر سجاد حیدر نے ہندوستانی معاشرے میں موجود معاملات کی عکاسی کی ہے۔ اس حوالے سے خصوصی توجہ شادی کے موضوع پر دی گئی ہے اور شادی کے حوالے سے لڑکے اور لڑکی دونوں کی رضامندی کو اہمیت دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں لڑکیوں میں جدید تعلیم کے منفی رجحان کی عکاسی بھی کی گئی ہے کہ وہ خواتین جدید مغربی تعلیم کو محض فیشن پرستی سے تعبیر کرتی ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔ حرماں نصیب میں فیروزہ کی صورت میں ایک روشن خیال اور باحوصلہ عورت کی تصویر کشی کی گئی ہے جو اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی عادی ہے۔ لیکن وہ خود اعتماد ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتی ہے اور اپنے بھائی سے شدید محبت کا جذبہ رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ بھائی کی وفات کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتی اور اپنوں سے التفات برتتی ہے۔ یہاں ایک عورت کی حیثیت سے فیروزہ کا اپنے لیے فیصلہ لینا اور تنہا زندگی کے سفر پر روانہ ہو جانا قابل ستائش ہے کہ وہ اس دور میں رہتے ہوئے معاملات سے بغاوت کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ نذر سجاد کا ایک اور اہم ناول ثریا ہے۔ اس ناول میں نذر سجاد حیدر نے بنا مرضی کی شادی کے منفی اثرات اور اس کی وجہ سے پیش آنے والے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ثریا ہے۔ ناول میں قصے کی بنت اس دور کے حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے بچوں کی مرضی کے بنا ان کی شادی طے کر دینے کے مسئلے پر کی گئی ہے۔ مذہب اور عشق میں سوشیلا ایک غیر مسلم لڑکی ہے جو اسلام میں عورتوں کے حقوق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتی ہے۔ اس کے مطابق دنیا کے کسی مذہب میں عورت سے مساوانہ سلوک روا نہیں رکھا گیا لیکن جب اسلامی احکامات میں شادی سے متعلق معاملات میں عورت کے اختیارات اور باقی تعلیمات میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کو دیکھتی ہے تو اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہاں عورت ایک مضبوط کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے جس میں وہ اپنی خواہشات کے لیے مذہب تک تبدیل کر لیتی ہے۔ اس ضمن میں جب اسے گھر والوں کی تنبیہ کا سامنا ہوا تو اس کا ردعمل یوں تھا:

> ''اس زمانہ میں کوئی کسی پر سختی کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ میں تو ہندوستانی ادب ولحاظ کی وجہ سے سب کچھ سہتی ہوں اگر نہ سہوں تو کسی کو مجھ پر بیجا تشدد کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیا آپ لوگ پرانے ہندوؤں کی روایات کو تازہ کرنا

چاہتے ہیں۔ ایک آزاد خیال لڑکی یہ سختی برداشت نہیں کر سکے گی"(۲۱)

نذر سجاد حیدر نے اس ناول میں اسلام میں عورت کی اہمیت کی وضاحت کی ہے اور معاشرے میں اس کے مقام کو بھی متعارف کروایا ہے۔

اے آر خاتون کے ناول افشاں اور تصویر، فاطمہ بیگم منشی فاضل کے ناول صبر کا پھل، کرنی کا پھل، لالچ کا شکار، وفائے مغرب اور غیرت کی پتلی وغیرہ میں اصلاحی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے نظریات کی پیشکش کی گئی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی طاہرہ بیگم کا ناول افسانہ نادر جہاں ہے۔ اس میں معاشری مسائل کی عکاسی کی گئی ہے جس میں دوسری شادی کے مسائل، سوتیلی ماں کے ظلم، اور زندگی کی دیگر تلخ حقیقتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اور لڑکیوں کو گھرداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں دینی تعلیم کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے اور عورت کو مرد کے برابر سمجھا گیا ہے اس کی مثال یوں ہے:

"یہ مسئلہ معلم آلثبوت ہے کہ امر تعلیم میں مرد اور عورت کا حق برابر ہے۔ اور ولی دختر پر فرض ہے کہ مثل پسر کے اس کی بھی تعلیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔(۲۲)

یہ ناول اصلاحی نقطہ نظر سے لکھا گیا تاکہ معاشرتی مسائل کا سد باب کیا جا سکے اور عورتوں کو اسلامی احکامات کے مطابق حقوق دیے جا سکیں۔

درج بالا خواتین کے علاوہ محمودہ بیگم، حمیدہ سلطان، ظفر جہاں بیگم، جمیلہ بیگم، صدیقہ بیگم، ثروت آر بیگم وغیرہ نے اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات کے مطابق کہانی کو لفظوں کے پیکر میں ڈھال کر نظریات کی تشکیل کی ہے۔ ان تمام ناولوں کا زبان و بیان سادہ اور سلیس تھا۔ ناول اصلاحی مقاصد کے زیر اثر تحریر کیے گئے تھے اس لیے فنی اعتبار سے ان میں اتنی پختگی موجود نہیں تھی جیسی ان کے بعد کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس دور کے اہم رجحانات میں اصلاح معاشرہ، تعلیم نسواں، مذہبی تعلیمات اور معاشرتی مسائل شامل ہیں۔ جن کا مقصد معاشرے کی بہتری تھا۔ اس دور میں جتنے بھی ناول تصنیف کیے گئے ان میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے کوششیں کی گئیں۔

جیسا کہ ادب معاشرہ کے رجحانات کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہے اسی طرح خواتین کے حقوق کے لیے چلائی جانے والی تحریک کے زیر اثر تصنیف کردہ ادب سے بھی معاشرے میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس میں خواتین

کے لیے تعلیم و ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں اور انھیں بھی تسخیر ذات کا موقع ملا۔اس سے پہلے وہ محض ایک معروض کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ جب خواتین کو گھروں سے باہر جانے اور تعلیم حاصل کرنے کی اجازت مل گئی تو ایک اور اہم مسئلہ پردے کے حوالے سے تحفظات کا پیش آیا۔ جس میں ضرورت سے زیادہ پردہ خواتین کے لیے وبال جان بن کر رہ گیا۔اس حوالے سے بھی بہت سے مصنفین نے کوششیں کیں۔پہلے جہاں عورت کو چار دیواری تک محدود کیا گیا تھا اور اس پر آواز تک کا پردہ بھی لازمی قرار دیا گیا تھا۔اب خواتین کے پردے کے حوالے سے بھی ایک نئی بحث کا آغاز ہوا بہت سے مرد مصنفین نے بھی پردے کی مخالفت کرتے ہوئے اسے خواتین کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا جس میں سب سے اہم نام عبدالحلیم شرر کا ہے۔ شرر نے زیادہ تر تاریخی ناول لکھے ہیں ان میں عورتوں کے فعال کردار ہیں جو بہادر ہیں، جنگجو ہیں اور مردانہ وار مردوں کے ساتھ جنگ کے میدانوں میں یا دوسری مہموں میں شریک ہیں اس کے علاوہ انھوں نے جو معاشرتی ناول لکھے ہیں ان میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا، پردے کی مخالفت، بغیر دیکھے شادی کے نقصانات، مرضی کے بغیر شادی وغیرہ کی مخالفت کی"(۲۳)شرر نے بدر النسا کی مصیبت میں ہندوستانی معاشرے کے بے جا رسوم و رواج کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ جس میں سب سے زیادہ طنز کا نشانہ صغر سنی کی منگنی اور نکاح کو بنایا گیا ہے۔اس کے علاوہ ہندوستانی معاشرے میں رائج نظام پردہ پر بات کرتے ہوئے شرر نے اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ شرر نے اپنے ناول میں پردے کے مخالفت تو نہیں کی، لیکن اس سے پیدا ہونے والی الجھنوں کا ذکر کر وا کر یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ ہر چیز کو توازن میں رکھنا چاہیے۔ کسی بھی چیز کی انتہا خرابی کا باعث بنتی ہے۔ ناول میں پردے کی وجہ سے دلہنوں کے بدل جانے کے واقعے کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ پردے کے حوالے سے بدر النسا کی مصیبت میں شرر یوں رقمطراز ہیں:

> "افسوس اس منحوس پردے نے خدا کے عدل و رحم اور اسلام کی فیاضانہ برکتوں کو بھی بے کار و بے اثر کر دیا۔ واقعی رسم بڑی بری بلا ہے جو ایمان و عقائد ہی نہیں انسان کی عقل پر بھی غالب آ جاتی ہے(۲۴)

پردے کی وجہ سے دلہنوں کے بدل جانے پر وہ یوں لکھتے ہیں:

> "آپ کا پردہ بڑے مزے کی بات ہے کہ لوگ چپکے ہی چپکے جورو بدل لیا کریں"(۲۵)

اسی حوالے سے وہ ہندوستانی رسم و رواج کو یوں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:

> "افسوس بھولی اور بے زبان لڑکیو! اس میں تمھاری کوئی خطا نہیں سارا قصور سوسائٹی کا ہے۔ سوسائٹی کی ان جاہلانہ رسوم سے جو نہ ہو تھوڑا ہے۔ کیا کیا نہ ہوا ہے۔ ابھی کیا کیا نہیں ہوگا؟ تم کو انسان بنایا اسلام سے تم کو برابر کے حقوق دیے مگر جاہلانہ رسوم پردہ نے تمھیں ایک بے جان سے بھی بد تر کر دیا"(۲۶)

وقت اور حالات کی تبدیلی ادب پر براہ راست اثر انداز ہوتی چلی جاتی ہے۔ یا یوں کہ لیجیے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات کی مناسبت سے ادب میں مختلف نظریات و افکار در آتے ہیں جو ایک نئے رجحان کو جنم دینے کے ساتھ ساتھ پرانے رجحان سے مستفید ہو کر فکر کو نئی سمت عطا کرتے ہیں۔ اردو ادب میں بھی وقت س کے ساتھ ساتھ مختلف تحریکیں اور رجحانات سامنے آئے۔ جن سے ادب براہ راست متاثر ہوا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ترقی پسند تحریک ہے جو ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ابھری اور تا حال اپنے نقش ادب پر چھوڑے ہوئے ہے۔ ناول کی صنف میں بھی ترقی پسند رجحانات کی عکاسی بہت سے مصنفین نے کی۔ اس سلسلے کا اہم نام پریم چند ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی عام عورت کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ پریم چند نے ہندو بیوہ کے مسائل کو بیان کیا اس کے علاوہ طوائف کا مسئلہ، بے جوڑ شادی، بے مرضی کی شادی انھوں نے بھی سخت مخالفت کی، عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی بھی حمایت کی" (۲۷) ان تمام مسائل کو ناول کے پیرائے میں پیش کر کے ہندوستانی معاشرے کو شعور و آگہی دلانے کی کوشش کی ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر کا شمار بھی ترقی پسند مصنفین کی صف میں ہوتا ہے انھوں نے بھی زندگی کے مسائل کے بارے میں بے دریغ لکھا۔ انھوں اپنے افکار کا اظہار افسانہ اور ناول دونوں اصناف میں کیا۔ ان کے اہم ناولوں میں کانٹے، سر شام، سمن، یہ شریف لوگ، اللہ میگھ دے اور دیوانہ مر گیا وغیرہ شامل ہیں۔

تقسیم ہند کے حوالے سے دیکھا جائے تو خدیجہ مستور کی تحریریں اس واقعے کی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنے افکار اور تقسیم ہند کے واقعات کو اپنے ناولوں آنگن اور زمین میں قلمبند کیا ہے۔ آنگن کی کہانی تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے حالات کا پتا دیتی ہے جس میں چھمی ایک مضبوط نسائی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ والدین کے انتقال کے بعد چھمی اپنے چچا کے گھر رہنے لگی اور چچا کے بیٹے جمیل کی محبت میں گرفتار ہو گئی لیکن جمیل کے التفات نے اس میں باغیانہ رویہ پروان چڑھایا اور وہ بات بے بات گھر میں ہنگامہ برپا کر دیتی۔ اپنے چچا جو کٹر کانگریسی تھے، ان کے آتے ہی مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیتی۔ دوسری طرف زمین میں تقسیم ہند کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

حجاب امتیاز علی سے پہلے اردو ادب میں جو ناول لکھے جا رہے تھے وہ بنیادی طور پر اصلاحی نوعیت کے تھے لیکن حجاب امتیاز علی نے نے اصلاح کی بجائے عشق و محبت، عالمی امن اور نفسیات کو اپنا موضوع بنایا جن میں رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے (۲۸) ان کے اہم ناولوں میں ظالم محبت، اندھیرا خواب، پاگل خانہ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ ظالم محبت ایک رومانی ناول ہے۔ جس میں جسوتی اور منصور کی داستان محبت رقم کی گئی ہے۔ جسوتی کی منگنی بچپن

میں کر دی گئی تھی لیکن وہ اپنی منگنی کو بھی منصور کی محبت کے داؤ پر لگانا چاہتی تھی۔ اسے منصور کی ہاں کا انتظار تھا تا کہ وہ اپنی زندگی اس کے ساتھ بسر کر سکے۔ جسوتی کے بارے میں مجیب احمد خان یوں رقمطراز ہیں:

"وہ ایک حقیقی جذبہ محبت رکھتی ہے۔ اس میں سماج کی رسم و روایت کے خلاف بغاوت کی لہر صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی محبت میں اتنی سرشار ہے کہ اسے اپنے باوقار خاندان کی عزت کی پروا نہیں ہوتی۔ اور منصور کو ہر حال میں حاصل کرنا چاہتی ہے" (۲۹)

جسوتی کا کردار سماج سے بغاوت پر تلا ہوا ایک کردار ہے جو اپنی محبت کے حصول کے لیے کسی بھی حد سے تجاوز کرنے کو تیار ہے اور معاشرتی اصول و ضوابط سے فرار کی راہ اپناتی ہے۔

عصمت چغتائی اردو کی ان ناول نگار خواتین میں شمار کی جاتی ہیں، جنھوں نے اردو ناول کے موضوعات اور پیرایہ بیان کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے ظلم سہتی، آنسو بہاتی خواتین کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک انسان میں اگر خود اپنی تقدیر بدلنے کا عزم ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اسے زیر نہیں کر سکتی۔ ساتھ ہی ہندوستانی معاشرے پر گہری چوٹ کی ہے۔ عصمت چغتائی کے مطابق معاشرہ ہی انسان کی پستی کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ "عورت بیوی کے روپ میں انھیں پسند نہیں کیونکہ اس روپ میں مرد اور مردانہ سماج کے ظلم سہنے پر مجبور ہے وہ سماج میں مرد کی حیثیت عورت کی حیثیت اور اسے درپیش مسائل کو اشتراکی انداز میں لیتی ہے (۳۰) انھوں مردانہ سماج کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انھوں ناول، افسانے، ڈرامے اور خاکے کی صنف میں اپنے نظریات کی پیشکش کی۔ ان کے ناول ضدی کے مرکزی کردار پورن اور آشا ہیں۔ ناول نچلے طبقے کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول میں طبقاتی تقسیم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کا نسائی کردار متحرک نہیں ہے بل کہ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے۔ "عصمت کے ناولوں کے دوسرے نسوانی کرداروں سے آشا بالکل الگ ہے۔ وہ دوسروں سے نہ ہی انتقام لیتی ہے اور نہ ہی اسے اپنی حیثیت کی کوئی پروا ہے۔ آشا کا کردار ایک روتی بسورتی لڑکی کا کردار ہے" (۳۱) عصمت چغتائی کا اہم ترین ناول ٹیڑھی لکیر ہے۔ "اردو ادب کا یہ پہلا ناول ہے جس میں ایک عورت نے ایک عورت کے جذبات، احساسات اور اس کی زندگی کے مختلف مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔" (۳۲) ناول میں عصمت چغتائی نے شمن کے بچپن سے لے کر ایام جوانی تک کے تمام حالات و واقعات اور اس کی نفسیاتی کیفیات و کشمکش کو احاطہ تحریر میں لا کر ایک کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک عورت کی طرف سے جنسی معاملات و مسائل کا برملا اظہار اس سے پہلے کبھی کسی کے ہاں نہیں ملتا تھا لیکن عصمت چغتائی نے معاملات کی سنگینی اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے انھیں ادب کا حصہ بنایا اور ایک لڑکی کو درپیش مسائل کا احاطہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ناول کے بارے میں ڈاکٹر خالد اشرف یوں رقمطراز ہیں:

"یہی عصمت کی اردو ناول کو اصل دین ہے کہ انھوں نے ناول کو زیادہ بے باکی اور جرات اظہار عطا کیا۔(۳۳)علاوہ ازیں انھوں نے اس ناول میں معاشرتی معاملات و مسائل پر بھی تنقید کی ہے۔ جن میں بیوہ کے مسائل ،دوسری شادی کے مسائل کا غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث ہونا شامل ہے۔ شمن ناول کا ایک فعال اور متحرک کردار ہے جو نا صرف گھریلو چار دیواری سے نکل کر تعلیم حاصل کرتی ہے بل کہ ملکی و سیاسی سرگرمیوں کی ایک فعال رکن بھی ہے۔ وہ معاشرتی حدود قیود سے منحرف ایک باغی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ان کے دیگر ناولوں میں **معصومہ،جنگلی کبوتر ،سودائی ،عجیب آدمی،دل کی دنیا،ایک قطرہ خون،باندی** وغیرہم شامل ہیں۔ جن میں مختلف معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان ناولوں میں پدر سری معاشرے پر سخت تنقید کی گئی ہے اور اسی نظام کو عورتوں کے استحصال کی وجہ قرار دیا گیا ہے، لیکن عصمت چغتائی نے عورت کو مضبوط اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے۔انھوں نے سماج سے بغاوت کا الم سربلند کرنے والی عورتوں کی تصویر کشی کر کے اردو ادب کو مختلف نسائی کردار عطا کیے ہیں۔ جو حالات سے مجبور ہو کر محض آنسو بہانے پر اکتفا نہیں کرتے بل کہ ان تمام رسوم و رواج کو تحس نحس کرتے ہوئے اپنی منزل کی تلاش خود کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنے افکار کی ترسیل اپنے ناولوں **ضدی،ٹیڑھی لکیر ،معصومہ** اور **سودائی** میں کی انھوں نے معاشرتی مسائل اور انسانی نفسیات کی کھل کر عکاسی کی جس کی وجہ سے انھیں فحش نگاری کے الزامات کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن انھوں نے اپنے مقصد کو کسی الزام کے بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔اور زمانے کی خرابیوں پر بے دریغ لکھتی چلی گئیں۔ عصمت چغتائی کی تحریروں میں جہاں معاشرتی مسائل کی عکاسی ہے وہاں عورتوں کی تعلیم و ترقی اور معاشرتی آزادی کی پر زور حمایت بھی کی گئی ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کی اقتصادی و سماجی حیثیت کو بلند کرنے کی بارہا ترغیب دی ہے۔

اردو ادب کی ناول نگار خواتین میں ایک اہم ترین نام قرۃالعین حیدر کا ہے انھوں نے **میرے بھی صنم خانے ،سفینہ غم دل،گردش رنگ چمن،آگ کا دریا،آخر شب کے ہمسفر ،کار جہاں دراز ہے** کے عنوانات سے ناول لکھے۔انھوں نے بھی خواتین کے مسائل پر قلم اٹھایا حمیرہ سعید کے مطابق:

> "انھوں نے عورت کے مقدر اس کی مجبوری اور اس کے استحصال کو ترجیحی طور پر اپنا موضوع بنایا وہ اکثر انسانی تقدیر کی ستم ظریفی اور زمانے کی مطلق العان طاقت کے سامنے انسانی عزائم کی شکست کو بھی عورت کی مجبوری کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں"(۳۴)

جمیلہ ہاشمی نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور فنی چابکدستی سے تمام موضوعات کو سمیٹا بھی ہے۔انسان دوستی،تاریخ، نفسیات اور دیگر مسائل حیات پر انھوں نے بڑی مہارت سے اپنے خیالات کی پیشکش کی ہے۔ ان کے

ناولوں میں تلاش بہاراں، آتش رفتہ، دشت سوس، چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو شامل ہیں۔

جیلانی بانو نے سماجی مسائل کی عکاسی اپنے ناولوں میں کی ہے۔ بانو قدسیہ کے نسائی کردار بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے نسائی کردار نفع نقصان سے قطع نظر اپنی زندگی کو ایسے راستے پر ڈال دیتے ہیں جہاں انھیں کوئی اذیت نہ پہنچ پائے لیکن اس عمل میں وہ خود اذیتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے مطابق:

"بانو کے یہاں قیوم، سیمی، امتل، روشن، عابدہ مادیت پسندی اور دیوانگی کے راستوں سے اپنی زندگی کو اذیت ناک بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق لاحاصل، جنسی دیوانگی اور نظریاتی افراتفری اسی پاگل پن کے شاخسانے ہیں"۔(۳۵)

رفیعہ منظور الامین، واجدہ تبسم، فرخندہ لودھی، رضیہ فصیح احمد وغیرہم ناول نگاری میں گراں قدر اضافے کا باعث ہیں ان تمام ناولوں میں انسانی زندگی، اس سے متعلقہ مسائل، معاشرہ، مذہب، سماج، نفسیات غرض ہر پہلو سے متعلقہ ناول تحریر کیے گئے ہیں درج بالا مصنفین کے علاوہ اور بھی بہت سی خواتین ناول نگاروں نے اس صنف میں اضافے کیے ہیں جس سے اردو ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ ان ناولوں نے اردو ادب میں ایک نئی روایت ڈالی جن میں نسائی کردار مردوں کے کرداروں کی نسبت زیادہ مضبوط اور قوت فیصلہ کے حامل ہیں۔ جو اپنا واضح نصب العین رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا لائحہ عمل تشکیل دیتے ہیں اور اپنی زندگی اپنے اصولوں کے مطابق گزارتے ہیں۔ ان تمام ناول نگاروں کے ہاں ایک ایسی عورت کا تصور ابھرتا ہے جو معاملات و معمولات زندگی میں الجھی ہوئی تو ضرور ہے لیکن وہ اس الجھن کو ہمیشہ رہنے نہیں دیتی بل کہ حکمت عملی سے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتی ہے۔

اردو ناول میں بے شمار مصنفین نے طبع آزمائی کی اور اپنے اپنے عہد کے شاہکار ناول بھی تخلیق کیے جن میں سے چند کو ابدی شہرت اور بقائے دوام بھی ملا بعض کو وقتی شہرت اور پذیرائی ملی تو بعض ناول انسانی زندگی کو سنوارنے اور انسانی مسائل کے حل تلاش کرنے کے لیے لکھے گئے۔ ان تمام تصانیف میں مصنفین نے اپنے اپنے نظریات و خیالات کی پیشکش بھی کی، اسی سلسلے کا ایک نام نذر سجاد حیدر اور دوسرا نام عصمت چغتائی ہے۔ نذر سجاد حیدر اور عصمت چغتائی کے ناولوں میں انسانی مسائل کی عکاسی بخوبی کی گئی ہے انھوں نے خاص طور پر اصلاحِ نسواں اور ان کی تعلیم کے لیے ناول تصنیف کیے۔ نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النساء بیگم میں بھی اپنے معاشرے کی تصویر کشی اور عورت کا معاشرے میں مقام دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں بھی انسانی نفسیات کو بالخصوص موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں عورت کا معاشرے میں مقام اور اس کو درپیش مسائل کی تصویر کشی ملتی ہے۔ زیر نظر تحقیق میں نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم اور عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر کا

متنی تجزیہ کیا جائے گا اور دونوں ناولوں میں نسائی کرداروں کا ارتقا دیکھا جائے گا۔ نذر سجاد حیدر کا ناول، ناول نگاری کے اوائل اور عصمت چغتائی کا ناول اس کی تیسری دہائی سے لیا گیا ہے۔ تقریباً تین دہائیوں میں ناول نگاری میں نسائی کرداروں کی ایک ارتقائی شکل ملتی ہے۔ زیر نظر تحقیق میں اس ارتقا کو پرکھا جائے گا۔ اس تحقیق کا مفروضہ بھی یہی ہے کہ اردو ناول کے نسائی کردار اپنی ارتقائی صورت میں نظر آتے ہیں اسی مفروضے کے زیر اثر ناولوں کا تنقیدی تجزیہ کر کے تقابلی مطالعہ کیا جائے گا اور یہ دیکھا جائے گا کہ ارتقا کس صورت میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حمیرا اشفاق،ڈاکٹر،"اردو فکشن کے فروغ میں خواتین کا کردار"،مشمولہ،جدید اردو فکشن: عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز ۲۰۱۰)،ص ۱۴۷۔

۲۔ بادشاہ منیر بخاری،"اردو ادب میں عورت کا تصور مرد کی نظر میں(اردو ناول کے خصوصی مطالعے کے ساتھ)"،مشمولہ،ادب کی نسائی رد تشکیل،مرتبہ فہمیدہ ریاض،(کراچی: وعدہ کتاب گھر،۲۰۰۶)،ص ۱۴۲،۱۴۱۔

۳۔ کلیات ڈپٹی نذیر احمد،مراۃ العروس،(لاہور: جمیل پرنٹنگ پریس،۲۰۰۵)،ص ۱۰۰۔

۴۔ ایضاً،ص ۱۰۱۔

۵۔ ایضاً،ص ۱۰۱۔

۶۔ جاوید اختر،سید،اردو کی ناول نگار خواتین:ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۷)،ص ۲۰۱۔

۷۔ صالحہ صدیقی،"تانیثیت اور تعلیم نسواں"،مشمولہ،اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں،مرتبہ صالحہ صدیقی،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۴)،ص ۱۵۸،۱۵۷۔

۸۔ رتن ناتھ سرشار،فسانہ آزاد،جلد اول،ص ۳۲۶۔

۹۔ جاوید اختر،سید،اردو کی ناول نگار خواتین:ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک،ص ۲۰۔

۱۰۔ زاہدہ حنا۔"رشندری،رشیدہ اور رقیہ کا خواب"،مشمولہ اصلاح النساازرشیدۃ النسا،(پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری،۲۰۰۷)،ص ۲۲۵۔

۱۱۔ دیباچہ، اصلاح النسا،ص ۶۔

۱۲۔ جاوید اختر،سید،اردو کی ناول نگار خواتین:ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک،ص ۲۲۔

۱۳۔ ایضاً،۲۷،۲۰۔

۱۴۔ حمیرہ سعید،ڈاکٹر،ص ۵۰۔

۱۵۔ اکبری بیگم،گودڑ کا لال،بحوالہ،ڈاکٹر حمیرہ سعید،اردو ناول میں نسائی حسیت،ص ۵۴۔

١٦۔ صغرا ہمایوں مرزا، سرگزشت ہاجرہ،(حیدرآباد،١٩٢٦)، ص ١٤۔

١٧۔ حمیرہ سعید، ص ٦٠۔

١٨۔ ایضاً، ص ٦٠۔

١٩۔ سیمیں ثمر فضل،ڈاکٹر۔ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ،(دہلی:اے ون فوٹو آفسیٹ۔١٩٩١)، ص ٣٤٤۔

٢٠۔ حمیرا سعید، ص ٤٧۔

٢١۔ نذر سجاد حیدر،مذہب اور عشق، مرتبہ قرۃالعین حیدر،(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،٢٠٠٤)، ص ٩٢۔

٢٢۔ طاہرہ بیگم،افسانہ نادر جہاں،حصہ دوم،(لکھنو:منشی نول کشور،١٩١٨)، ص ٢٢٥۔

٢٣۔ بادشاہ منیر بخاری،"اردو ادب میں عورت کا تصور مرد کی نظر میں"، مشمولہ،ادب کی نسائی رد تشکیل، مرتبہ فہمیدہ ریاض،(کراچی وعدہ کتاب گھر،٢٠٠٦)، ص ١٣٠۔

٢٤۔ عبدالحلیم شرر،بدر النسا کی مصیبت،(بمبئی:مکتبہ سلطانی،١٩٠١)، ص ٢٦،٢٥۔

٢٥۔ ایضاً، ص ٥٦۔

٢٦۔ ایضاً، ص ٥٥۔

٢٧۔ بادشاہ منیر بخاری، ص ١٣١۔

٢٨۔ حمیرہ سعید، ص ٨٥۔

٢٩۔ مجیب احمد خان۔حجاب امتیاز علی :حیات اور کارنامے،(دہلی: تخلیق کار پبلی کیشنز۔١٩٩٦)، ص ١١٩۔

٣٠۔ حمیرہ سعید، ص ١٢٨۔

٣١۔ ایضاً، ص ١٠٤۔

٣٢۔ ایضاً، ص ١٠٩۔

٣٣۔ خالد اشرف،ڈاکٹر،بر صغیر میں اردو ناول،(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،١٩٩٤)، ص ٣٧۔

٣٤۔ حمیرا سعید، ص۔ ٢٠١

٣٥۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے چند اہم زاویے،(پاکستان:انجمن اردو،٢٠٠٣)، ص ٣٩

باب دوم:

نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم میں نسائی کرداروں کا ارتقا

باب دوم:

نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم میں نسائی کرداروں کا ارتقا

نذر سجاد حیدر اردو ادب کی معروف ناول نگار ہیں۔انھوں نے اپنی تحریروں میں فروغِ تعلیم نسواں کی بھرپور حمایت کی وہ اس نظریے کی حامی ہیں کہ تعلیم ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہمیں کسی طور یہ حق حاصل نہیں کہ خواتین کو تعلیم سے محروم رکھیں۔انھوں نے اپنے ناولوں میں اس نظریے کی پیشکش بھی کی ہے کہ پڑھی لکھی عورت ہی معاشرے کی اصلاح میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکتی ہے اور اس کے مسائل کا حل بھی نکال سکتی ہے۔ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ ہے،ماں سے وہ سیکھنے کی ابتدا کرتا ہے تو اگر عورت پڑھی لکھی ہو گی تب ہی اس کی بنیادی تربیت درست طریقے کرتے ہوئے معاشرے کا کارآمد فرد بنانے میں کامیاب ہو گی۔

نذر سجاد حیدر بیسویں صدی کے نصف اول کی ممتاز ناول نگار ہیں۔انھوں نے معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ فروغ تعلیمِ نسواں کی حمایت کی اور خواتین کے اس گروہ، جس کی آواز کا گھر کی چار دیواری سے باہر نکالنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، کی آواز کو بلند کیا اور ان کے مسائل کے حل کے لیے مناسب اقدامات کیے۔ڈاکٹر سید جاوید اختر نذر سجاد حیدر کے خواتین کی تعلیم و ترقی کے حوالے سے کیے گئے اقدامات کو سراہتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> "نذر سجاد حیدر جس ہندستانی مسلم معاشرے کا حصہ تھیں اس میں ان کو جدت پسند عورت سمجھا جاتا تھا۔وہ ہندوستانی مسلمانوں میں ان اولین خاتون رہنماؤں میں سے تھیں جنھوں نے لاتعداد بے زبان عورتوں کی حمایت میں آواز اٹھائی اور انھیں مردوں کے پنجہ استبداد سے رہا کرانے کی جدوجہد کی ان کے متعدد افسانے اور ناول اسی جدوجہد کی غمازی کرتے ہیں۔"(۱)

نذر سجاد حیدر نے اپنے نظریات کی ترسیل و پیشکش کے لیے کئی ناول بھی تحریر کیے جن میں اختر النسا بیگم، جان باز، حرماں نصیب، آہ مظلوماں، نجمہ، اور ثریا شامل ہیں۔مصنف اپنے نظریات اپنے گرد و نواح سے اخذ کر کے انھیں ادب میں پیش کرتا ہے۔نذر سجاد حیدر نے بھی اپنے ناولوں میں اس

دور کے ہندوستانی معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی اور ان تصاویر میں یوں رنگ بھرے ہیں کہ تمام تر احوال اپنے حقیقت سمیت قاری کے ذہن پر نقش چھوڑ دیتے ہیں۔ نذر سجاد سماجی اور اصلاحی کاموں کی سرگرم رکن تھیں اس لیے اس کی پیشکش ان کی تحریروں میں واضح نظر آتی ہے۔ نذر سجاد حیدر نے اپنے ناولوں میں معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس میں موجود مسائل سے پردہ اٹھایا ہے اور پھر ان مسائل کے سد باب کی کوشش کی ہے اور ساتھ ساتھ ان سماجی مسائل کا مناسب حل بھی تجویز کیا ہے۔ ڈاکٹر حمیرہ سعید اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

> "ایسے وقت میں جب کہ معاشرہ اس حد تک رسمی اور روایتی ہو کہ شریف خاتون کی آواز کا گھر سے باہر پہنچنا جرم سمجھا جائے، نذر سجاد حیدر خواتین کو ایک ایسی زندگی جینے کی دعوت دیتی ہیں جس پر صدیوں تک مردوں نے اپنی اجارہ داری سمجھی ہو۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ خواتین معاشرے کا اہم جز ہونے کے ناطے اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لیں اور اپنی صلاحیتوں کو پہچان کرا سے ممکن حد تک بروئے کار لائیں۔"(۴)

زیر نظر تحقیق نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم پر کی گئی ہے۔ ۱۹۱۰ میں نذر سجاد حیدر کا یہ پہلا ناول دار الاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہوا(۳) یہ تحقیق ناول اختر النسا بیگم کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ جس میں ناول کے متن کا عمیق مشاہدہ کر کے اس میں نذر سجاد حیدر کے پیش کردہ نظریات کا جائزہ لیا جائے گا اور ناول میں نسائی کرداروں کی پیشکش کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔

ناول کا عنوان "اختر النسا بیگم ہے اور ناول کا مرکزی کردار بھی اختر النسا ہی ہے۔ اس حوالے سے اسے کرداری ناول کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ناول میں تئیس ابواب پر مشتمل اختر کی داستانِ زندگی رقم کی گئی ہے جو خالصتاً شعور و تعلیم نسواں کے فروغ کے مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ اس میں خواتین کی تعلیم کی حمایت کے لیے نظریے کی ترتیب دی گئی ہے۔ ناول میں ہندوستان کے اعلیٰ متوسط طبقے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جس میں تعلیم یافتہ اور ان پڑھ دونوں طرح کے کردار پیش کیے گئے اور یہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پڑھا لکھا انسان ہی زمانے کا بہتر اور پر وقار فرد بن سکتا ہے اور معاشرے میں مثبت تبدیلی لا سکتا ہے۔ جبکہ ان پڑھ انسان معاشرے پر از خود ایک بوجھ کی حیثیت رکھتا ہے اور منفی کردار معاشرے میں تخریبی رویوں کو ہوا دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ ناول میں نذر سجاد حیدر نے تعلیم یافتہ اور ان پڑھ اشخاص کے موازنے سے نظریہ تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ تعلیم کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشرے میں پائے جانے والے فرسودہ رسوم ورواج اور ان کے نتیجے میں ہونے والے مسائل اور معاملات کو بھی ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان پڑھ خواتین شعور نہ ہونے کی وجہ سے دیرینہ رسومات میں الجھی ہوئی ہیں اور اپنے وقت اور روپے کے زیاں سے بے خبر معاشرے میں اونچی ناک کے چکر میں الجھ کر رہ گئیں ہیں حالاں کہ وہ اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ معاشرے میں قدر و منزلت

روپے پیسے سے نہیں بلکہ اچھی اقدار سے ہوتی ہے۔ یہاں مادی فکر کا تجزیہ ایک قابل ذہن سے کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک پڑھی لکھی عورت اپنی عقل و فہم کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے قیمتی وقت اور روپے کو برباد ہونے سے بچا لیتی ہے اور دوسروں کے لیے بھی باعث تکلیف نہیں بنتی۔ رسومات کا ذکر کرتے ہوئے شادی کے معاملات اور اس سے متعلقہ رسومات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے، جس میں خواندہ اور ناخواندہ دونوں طبقات کے کردار پیش کیے گئے ہیں۔ رسومات کی ذیل میں صغر سنی کی منگنی، لڑکی اور لڑکے کا شادی کے بارے میں رائے کا اظہار اور پسندیدگی، بچے کی پیدائش پر کی جانے والی بے جا رسومات، بیوہ کو پیش آنے والے مسائل خصوصاً مسئلہ معاش وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی دوران معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اور اس کے مسائل کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور یہ باور کروانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح معاشرہ عورت کے راستے کی رکاوٹ بن کر اسے رسوم و رواج کے چکر میں الجھائے رکھتا ہے۔ ایسے میں اسے اپنے وقار کو برقرار رکھنے اور اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کے لیے لباس، نام اور بعض اوقات طرز رہن سہن تک کو تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ ناول میں اس وقت کے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی بہترین انداز میں کی گئی ہے جس سے نہ صرف معاشرتی اقدار کے بارے میں معلومات ملتی ہیں بل کہ انسانی رویے اور ان کے فرد پر اثرات بھی بخوبی سمجھے جا سکتے ہیں۔ ناول میں خواتین کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے اور ایک سوتیلی ماں کے دباؤ میں دبی ہوئی بن ماں کی بچی کے حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس حوالے سے احمد پراچہ یوں رقمطراز ہیں:

> "ان کے ناول آزادی سے قبل اعلیٰ متوسط طبقہ کی تہذیب اور معاشرت، افکار و اقدار اور مسائل کا آئینہ دار ہیں۔ لیکن ان میں عورت کے دل دھڑکن بھی سنی جا سکتی اور یہ ہر جگہ درد اور کرب سے کراہتی ہوئی نظر آتی ہے۔۔۔ یہ ناول عصری زندگی کے پس منظر میں عورت کے مسائل، اس کے حقیقی جذبات اور خوابوں کے آئینہ دار ہیں۔"(۴)

اختر النسا بیگم کے موضوعات کو زیر بحث لاتے ہوئے ڈاکٹر سلطانہ بخش یوں رقمطراز ہیں:

> "یہ ایک ترقی پسند ناول ہے جس کی ہیروئین اختر النسا بیگم تعلیم یافتہ لڑکیوں کا آئیڈیل، اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال، باحیا اور قوم پرست خاتون ہے جو اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے معاشرے کے مظالم کا نہایت عقل مندی سے مقابلہ کرتی ہے۔"(۵)

ذیل کی سطور میں ناول کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا جس سے ناول میں موجود مخفی مفاہیم و معانی اخذ کرنے اور نذر سجاد حیدر کے نظریات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اور ناول میں موجود نسائی کرداروں کا جائزہ لیا جائے گا۔

۱ تعلیمِ نسواں کی اہمیت: ادبی رسائل کا کردار

انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد کٹر روایت پسند مسلمانوں نے خود پر جدید تعلیم کے دروازے بند کر لیے تھے، جس کے نتیجے میں ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے۔ یہ روایت پسندی مسلم گھرانوں میں خواتین کی تعلیم کے حصول میں بھی روا رکھی اور انھیں پردے اور دیگر معاشرتی حدود و قیود کے نام پر گھروں تک محدود کر دیا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کی تربیت کی ٹھانی اور انھیں جدید تعلیم کی ضرورت اور اہمیت دلانے کے لیے سرگرم عمل ہوئے۔ جب مردوں کی تعلیم کے راستے ہموار ہو چکے تو اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ مرد اور عورت دونوں ہی معاشرے کا اہم حصہ ہیں کسی ایک کی کمی بھی توازن بگاڑ سکتی ہے تو پھر محض مردوں کی تعلیم ہی کیوں ضروری قرار دی جائے بل کہ خواتین کو بھی علم حاصل کرنے کا حق مردوں کے برابر کا حاصل ہے۔ یوں اس دور میں باقاعدہ تعلیم و شعورِ نسواں کی تحریک چلی اور اس میں شیخ عبداللہ اور بیگم عبداللہ نے اپنی اہم ترین خدمات سرانجام دیں علاوہ ازیں مشنریوں کے تحت کھولے گئے سکولوں نے بھی تعلیم نسواں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ سکولوں میں تعلیم دلوانے کے لیے بہت سے مسلم گھرانوں نے مزاحمت کا اظہار کیا۔ ایسی صورت حال میں ادبی رسائل کے ذریعے گھر گھر تعلیم و تربیتِ نسواں کا آغاز کیا گیا۔ بہت سی خواتین نے ان رسائل میں مسائل نسواں کا ذکر اور ان کا حل تجویز کیا۔ اس دور کے خواتین کے لیے نکالے گئے رسائل اور ادب میں "تعلیم نسواں" اہم ترین موضوع تھا۔ بعد میں جتنے بھی مصنفین منظر عام پر آئے انھوں نے تعلیم کے موضوع کو کسی نہ کسی صورت میں بطور خاص اپنی تصنیف کا حصہ بنایا۔ ان میں نذر سجاد حیدر کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے انھوں نے بھی فروغِ تعلیم نسواں کی بھرپور حمایت کی ڈاکٹر حمیرہ سعید اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ:

> "نذر سجاد حیدر کی حسیت سماج میں عورت کی حیثیت اور حالت کو بدلنا چاہتی تھیں اسی لیے وہ تعلیم یافتہ اور خود اعتماد، باہمت اور آزاد خیال نسوانی کرداروں کو اپنے ناولوں میں پیش کرتی ہیں۔"(۲)

ناول اختر النسا بیگم کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کہانی کی بنت ایک خاص مقصد یعنی فروغِ تعلیمِ نسواں کے تحت کی گئی ہے۔ اس میں نذر سجاد نے ضمنی قصوں کی صورت میں کرداروں کے اعمال و افکار کی مدد سے تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس کی تصدیق ڈاکٹر حمیرہ سعید کی درج ذیل سطور سے ہوتی ہے:

> "دراصل اختر النسا بیگم ناول کے ذریعہ نذر سجاد حیدر تعلیم نسواں کا پرچار اور عورتوں کی اصلاح چاہتی تھیں اسی لیے انھوں نے اختر النسا بیگم اور مسز وقار جیسے کردار پیش کیے جو صحیح تعلیم و تربیت کی وجہ سے اپنی زندگی کی ایک صحیح راہ متعین کر پاتی ہیں"(۷)

ناول میں جہاں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں خواتین کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی اور خواتین کے علمی مراتب کے تحت ان پڑھ خواتین کی روایت پرستی اور پڑھی لکھی خواتین کی جدت پسندی کے بارے میں نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ناول میں جس طرح بار بار پڑھی لکھی عورت کا موازنہ ان پڑھ عورت سے کیا گیا ہے اور پڑھی لکھی عورت کے افکار و کردار کو ان پڑھ کے افکار و کردار سے اونچا دکھایا گیا ہے۔ ناول میں دونوں قسم کے کرداروں کی قدامت پرستی اور جدیدیت پسندی کو موضوع بحث بناتے ہوئے تعلیم کے مثبت اثرات کی حمایت کی گئی ہے۔ جس سے فروغِ تعلیم نسواں کے نظریے کی تشکیل ہوتی ہے۔ اختر النسا بیگم میں نذر سجاد حیدر نے اختر النسا کے اپنے والد سے مکالمے کے بعد باپ پر اس کی قابلیت کے اثرات کو یوں بیان کیا ہے:

> "بیٹی کی اس تقریر کا باپ کے دل پر بے انتہا اثر ہوا۔ اور زیادہ نہیں تو چند منٹوں کے لیے انھیں معلوم ہو گیا کہ تعلیم کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اور جہالت کا کیا۔ اسی وقت بیوی نے انھیں کس رنگ میں قصہ سنایا تھا اور بیٹی نے کس طریق سے۔۔۔" (۸)

اسی نظریہ تعلیم کو مزید بیان کرتے ہوئے نذر سجاد حیدر نے شادی کے موقع پر اختر کے شوہر ظفر، جو کہ محض پڑھا لکھا اور خود کو باشعور ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا، کی حرکات و سکنات پر اختر کے والد کے نظریات کو یوں بیان کیا ہے:

> "۔۔۔ ایک جاہل اور عالم بل کہ کم علم اور عالم کے طریق گفتگو اور آداب ملاقات وغیرہ میں بے انتہا فرق ہوتا ہے خواہ اپنے آپ کو کوئی کتنا ہی بنانا چاہے۔ مگر نہیں بن سکتا" (۹)

اختر النسا بیگم میں خاص طور پر تعلیم نسواں کی حمایت کی گئی ہے اور اس کو سماج اور انسان کے اطوار سے مربوط کر کے اس طرح پیش کیا گیا ہے:

> "اگر بہتری قوم منظور ہے تو سب سے پہلے جہاں تک ممکن ہو سکے تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیے کہ تمام قوم سنبھل گئی کیوں کہ بے علم معراج ترقی پر پہنچنا ناممکن۔ خواہ آپ کتنا ہی علم حاصل کر لیں کبھی آگے نہ بڑھ سکیں گے جب تک کہ دنیا میں اپنی سب سے پہلی رہنما عورتوں کو جن کی گود تمام قوم کا ابتدائی سکول ہے۔ چشمہ علم سے سیراب نہ کریں گے۔" (۱۰)

درج بالا اقتباس سے حمایتِ تعلیم نسواں کا نظریہ واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے کہ جب تک بچے کی پہلی درسگاہ میں علم کے موتی نہیں ہوں گے وہ دنیا کے سمندر سے بے گوہر ہی نکلے گا۔ دنیا کے تمام علوم ایک طرف اور ماں کی گود میں سیکھا ہوا درس ایک طرف ہوتا ہے کیوں کہ بچے کی نشو نما کے ابتدائی چند سال اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتے

ہیں وہ ابتدائی چند سالوں میں جو سیکھ لیتا ہے اسی نظریے کی بنیاد پر اپنی باقی کی عمر کو سنوارنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کی شخصیت کی جو تشکیل ابتدائی سالوں میں ہوتی ہے وہ تاحیات اس کے ہم قدم رہتی ہے۔ کسی بھی فرد کی زندگی میں تعلیم نسواں اتنی اہم ہے کہ اس کے بغیر معاشرے میں مثبت اور تعمیری رویوں کا تصور بھی محال ہے۔اس لیے خواتین پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جب اس کی گود میں کوئی بچہ آئے تو وہ اسے اپنے علم کے خزانے سے وہ گوہر کامل عطا کرے جو تمام عمر اس کے لیے ہدایت ور ہنمائی کا باعث بنیں۔

۲۔لڑکیوں کی تعلیم میں رکاوٹ: معاشرہ

لڑکیوں کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹیں اور نسائی کرداروں کا سماجی

ابتدا میں جب تعلیمی تحریکیں عروج پر پہنچیں اوران کے نمایاں اثرات معاشرے پر مرتب ہونا شروع ہوئے تو مسلمان مرد خود تو جدید علوم سیکھنے کے لیے آمادہ ہو گئے لیکن کسی طور بھی خواتین کی تعلیم و ترقی کے حق میں نہ تھے۔ان کے لیے خواتین کا تعلیم کے لیے گھر سے نکلنا تو درکنار علمی وادبی کتب کا مطالعہ بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔اس دور کی خواتین مردوں کے بنائے گئے اصولوں پر زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ اس دور میں خواتین کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے کے کے کھلر لکھتے ہیں کہ "لکھنا پڑھنا تو درکنار ان کو سکول بھیجنا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا" دوسری طرف کچھ مسلمان خاندان ایسے بھی تھے جو خواتین کی تعلیم کے مخالف محض اس لیے تھے کیوں کہ تعلیمی اداروں میں مسلمان خواتین کے لیے الگ تعلیمی سہولتیں میسر نہیں تھیں اور انھیں غیر مذہب کی خواتین کے ساتھ تعلیم دی جارہی تھی۔ان حالات میں یہ مسلم گھرانے خوف اور عدم تحفظ کا شکار تھے۔ انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں ہندو اور پارسی خواتین کے میل جول سے مسلمان خواتین اپنا مذہب تبدیل نہ کرلیں۔اسی ضمن میں نجم السحر اعظمی رقم طراز ہیں کہ :

> "مشنریوں کے ذریعے چلائے گئے اسکولوں میں اونچی ذات کے ہندو اور مسلمان اپنی لڑکیوں کو بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے، کیوں کہ تبدیلیٔ مذہب کا خطرہ تھا"(۱۴)

اختر النسا بیگم میں بھی اسی طرح کے مسائل کی ایک تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ اگر عورت معاشرے کی تنگ نظری کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے حالات بدلنے کی کوشش کر بھی لے تو معاشرہ اوراس میں بسنے والے افراد اسے کسی طور تنقید کا نشانہ بنانے سے رکتے نہیں ہیں۔ان پڑھ سوتیلی ماں کے ہوتے ہوئے اختر النسا کو بھی ان مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور اس پر بھی اسی قسم کے الزامات لگائے گئے۔ ناول میں اس کی پیشکش کچھ یوں کی گئی ہے :

> "۔۔۔بیگم کا خیال تھا کہ انھوں نے اپنے اسکول ہی میں ملازمت کرلی ہوگی۔ تو جو چاہیں گے ان کی نسبت مشہور کر دیں گے اور یہ صلاح ہوئی تھی کہ امانی کی واپسی پر یہ مشہور کیا

جائے گا کہ لکھنؤ کے بڑے گرجے میں (نہایت دبی زبان سے) صاحبزادی کے دشمن خدا نہ کرے عیسائی ہو گئے۔

یہ تجویز اس لیے کی گئی تھی کہ سب لوگ اور آپ بجائے عزت و محبت کے ان کے دشمنوں کو حقارت سے یاد کریں۔"(۱۳)

اس دور میں یہ تصور عام تھا کہ مسلم لڑکیوں کو اگر غیر مذہب کی لڑکیوں کے ساتھ تعلیم دلوائی جائے تو وہ اپنا مذہب تبدیل کر لیں گی۔ اسی معاشرتی رویے کو درج بالا سطور میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کے راستے میں رکاوٹ قائم کرنے کے لیے اس طرح کے الزامات بھی لگائے جاتے رہے ہیں اور اقربا کے دلوں میں اسی ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے دوریاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے ان پڑھ طبقے کی ذہنیت واضح ہوتی ہے کہ کس طرح وہ اپنی کم علمی و کم فہمی سے مسائل اور الجھاؤ پیدا کر دیتی ہیں۔ اختر النسا بیگم کے کردار سے نذر سجاد حیدر نے معاشرے کے بڑھتے ہوئے مسائل کا جو حل تجویز کیا ہے وہ تعلیم نسواں ہے اس کے بنا یہ معمہ سلجھانا ناممکن ہے ۔ناول میں اختر کی فہم و فراست اور عقل و دانش کی وجہ تعلیم ہی کو قرار دیا گیا ہے اور یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ اگر خواتین کو تعلیم دلوائی جائے تبھی آنے والی نسلیں سدھر سکتی ہیں۔ اس کی مثال ذیل کی سطور سے ملتی ہے:

"اگر بہتری قوم منظور ہے تو سب سے پہلے جہاں تک ممکن ہو سکے تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیے کہ تمام قوم سنبھل گئی کیوں کہ بے علم معراج ترقی پر پہنچنا ناممکن۔ خواہ آپ کتنا ہی علم حاصل کر لیں کبھی آگے نہ بڑھ سکیں گے جب تک کہ دنیا میں اپنی سب سے پہلی رہنما عورتوں کو جن کی گود تمام قوم کا ابتدائی سکول ہے۔ چشمہ علم سے سیراب نہ کریں گے۔"(۱۴)

درج بالا اقتباس سے حمایتِ تعلیم نسواں کا نظریہ واضح طور پر سامنے آجاتا ہے کہ جب تک بچے کی پہلی درسگاہ میں علم کے موتی نہیں ہوں گے وہ دنیا کے سمندر سے بے گوہر ہی نکلے گا۔ دنیا کے تمام علوم ایک طرف اور ماں کی گود میں سیکھا ہوا درس ایک طرف ہوتا ہے کیوں کہ بچے کی نشو نما کے ابتدائی چند سال اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ ابتدائی چند سالوں میں جو سیکھ لیتا ہے اسی نظریے کو سنوارنے میں اپنی باقی کی عمر صرف کر دیتا ہے۔ اس کی شخصیت کی جو تشکیل ابتدائی سالوں میں ہوتی ہے وہ پوری عمر اس کے ہم قدم رہتی ہے۔ اسی تعلیم نسواں اتنی اہم ہے کہ اگر کسی خاتون کی گود میں جب کوئی بچہ آئے تو وہ اسے اپنے علم کے خزانے سے وہ گوہر کامل عطا کرے جو تمام عمر اس کے لیے نفع کا باعث بنیں۔ اختر النسا بیگم میں تعلیم یافتہ عورت کی روشن خیالی پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سید جاوید اختر رقمطراز ہیں کہ:

"اختر النسا بیگم ایک تعلیم یافتہ سگھڑ لڑکی کا قصہ ہے۔ جس نے سوتیلی ماں کی دشمنی سے بری جگہ بیاہے جانے پر سخت اذیتیں اٹھائی اور آخر اپنی روشن خیالی سے ان سب مشکلات پر قابو پایا۔"(۱۵)

۳ پڑھے لکھے اور ان پڑھ کردار میں افتراقات اور ان کی خصوصیات:

اختر النسا بیگم خاص طور پر فروغ تعلیم نسواں کے لیے احاطہ تحریر میں لایا گیا اسی لیے اس کے تمام کردار ،اسلوب اور پلاٹ فروغِ تعلیم نسواں کی حمایت کے لیے بنا گیا ہے۔ کرداروں کے حوالے سے بات کی جائے تو جدید تعلیم سے آراستہ، روشن خیال اور جدت پسند کردار بھی ملتے ہیں جن میں اختر النسا بیگم، مسٹر و مسز وقار اور ان کے خاندان کے دیگر افراد جن میں بچے، بہن اور داماد وغیر ہم شامل ہیں، ناول کے آغاز میں اختر کو ایک مجبور اور مفلوک الحال بن ماں کی بچی کے طور پر دکھایا گیا ہے جو اپنی سوتیلی ماں کے مظالم سہنے پر مجبور ہے لیکن وہ اپنی تعلیم و تربیت کی بنا پر بالآخر وہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے جو اس کی خواہش تھی اور ضرورت بھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اختر نے نامساعد حالات کے باوجود جدوجہد جاری رکھی، پہلے ماں کی وفات، سوتیلی ماں کا آنا، تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں، پسند کے بنا ان پڑھ لڑکے سے بیاہا جانا، شوہر کی وفات اور سسرال والوں کا ناروا سلوک اور پھر گھر سے نکالا جانا ایسے واقعات تھے جو اس دور کی ہندوستانی لڑکیوں کے لیے کسی مصیبت سے کم نہ تھے لیکن اختر نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ تعلیم ایک ایسا سہارا ہے، جو انسان کو خود اعتمادی سکھاتی ہے۔ اور ایک پڑھا لکھا انسان کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ انسان کے معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاق و کردار پر تعلیم کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ پڑھا لکھا شخص کبھی بھی کسی کو تکلیف پہنچانے یا لاشعوری طور پر ایذا پہنچانے کا خیال بھی دل میں نہیں آنے دیتا۔ کسی کے لیے مصیبت کا سوچنا تو دور لاشعوری طور پر بھی ایذا نہیں پہنچا سکتا اس کی مثال اختر اور ظفر کے مابین مکالمے سے ملتی ہے:

"ظفر: ہائے آپ نے بڑا غضب کیا۔ اسی وقت وہ خطوط مجھے کیوں نہ دے دیے۔ جس سے میں ان کو جھوٹا کر سکتا۔

اختر: میں شر بڑھانے کی کبھی کوشش نہیں کرتی۔ اگر میری یہ عادت ہوتی تو جانی بیگم کی خفیہ و نادرست کارروائیاں ابا میاں پر منکشف کرتی رہتی۔ جس سے کبھی کی میرے گھر سے ان کی بنیاد اکھڑ جاتی۔ اور آج وہ اندھا راج نہ کر رہی ہوتیں۔"(۱۶)

دوسرا اہم ترین اور فعال کردار مسز وقار کا ہے جو جدت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم فرسودہ رسوم و رواج کے خاتمے کے لیے عملی کاوشیں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مسز وقار ایک فعال کردار کی حیثیت سے ناول میں نظر آتی ہیں

جو اپنے شعور، فہم اور روشن خیالی کی بنا پر ہندوستانی معاشرے میں فرسودہ رسومات کے خاتمے کی کوشش کرتی ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔ اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ رسومات ہمارے پاؤں کی زنجیر کے سوا کچھ نہیں ہیں جو ہمیں محض الجھانے کا کام سرانجام دیتی ہے۔ اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔

ناول چوں کہ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے احاطہ تحریر میں لایا گیا۔ اس لیے اس میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ کرداروں میں افتراقات کو واضح کرنے کے لیے دونوں طبقات سے کردار پیش کیے گئے ہیں۔ باعمل اور فعال کرداروں میں اختر اس کی خالہ کا خاندان اور والد شامل ہیں جب کہ دوسری طرف اختر کی سوتیلی ماں، بہن، اور سسرال کے تمام لوگ شامل ہیں جو نہ صرف علم کی دولت سے محروم ہیں بل کہ اخلاقی اقدار سے بھی عاری ہیں اور معاشرے میں شر پھیلانے اور انسانیت کو تکلیف پہنچانے کے سوا کوئی اور فریضہ سرانجام دینے سے قاصر ہیں۔

اختر کی سوتیلی ماں ان پڑھ کرداروں میں سب سے نمایاں کردار ہے جو اپنے کردار و اطوار سے نہ صرف اختر کے لیے مصیبتیں کھڑی کرتی ہے بل کہ اپنے شوہر کو بھی نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی۔

اسی طرح دوسری طرف اختر کے سسرال کے تمام کردار بھی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اخلاقی اقدار سے یکسر محروم تھے اور اس قدر گراوٹ کا شکار تھے کہ بیمار دلہن کو چھوڑ کر دھن سمیٹنے میں مصروف ہو گئے اور اختر کی بیماری کی ذرا پروا کیے بنا روایتی ساسوں کا رویہ اپنا لیا اور انسانی ہمدردی سے عاری اسے کام کاج میں لگا دیا۔ اختر کی ساس کے کردار کی فطرت کی عکاسی ان کے درج ذیل جملوں سے ہوتی ہے:

> "۔۔۔۔امیر تھیں تو باپ کے گھر تھیں۔ اب تو غریبوں میں آئیں ہیں۔ غریب ہیں کب تک باوا کے گھر کی یخنی پر گزارا کریں گی؟ کھائیں یا نہ کھائیں۔ یہی دال روٹی ہے۔۔۔۔
>
> مانا کہ نئی دلہن ہیں۔ بیمار ہیں۔ لیکن ایسے چوچلے امیروں میں ہوا کرتے ہیں۔ غریبوں کی بہوئیں ڈولے سے نکلتے ہی کام کرنے لگتی ہیں۔۔۔۔" (۱۷)

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اختر سے شادی محض مادی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی گئی تھی اس لیے اختر کے گھر والوں کو اس کی ذات کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ جب ظفر کے والدین نے اختر کا لایا ہوا تمام اسباب سمیٹ لیا تو وہ اس کے وجود سے بھی نالاں ہو گئے اور بات بے بات کوئی نہ کوئی مسئلہ اٹھایا جانے لگا ایک روز کسی معاملے پر ظفر اور اس کی ماں کی بحث طول پکڑ گئی تو اس کی ماں نے بنا سوچے سمجھے بہو بیٹے کو گھر سے نکل جانے کو کہا

اور اس بات کا خیال بھی نہ رکھا کہ اس کا ان پڑھ بیٹا اپنی گزر اوقات کیسے کرے گا اور اپنی بیمار بیوی کے اخراجات کو کیسے اٹھائے گا۔

۴ اصلاح معاشرہ:

نذر سجاد حیدر نے جس دور میں اپنی ادبی خدمات کا آغاز کیا اس دور میں انسانیت بری طرح مجروح ہو رہی تھی اور محض مرد عورت کا استحصال نہیں کر رہا تھا بل کہ انسان کے ہاتھوں انسانیت کا استحصال جاری تھا۔ طاقت ور کم زور پر، حاکم محکوم پر بری طرح سے تسلط پا چکا تھا۔ اس سے معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو گیا تھا اور بے پناہ مسائل کا گھر بن گیا تھا۔ اس کی ایک اہم وجہ تعلیم اور شعور و آگہی کا فقدان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "نذر سجاد حیدر سماجی اور اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں"(۱۸) اور ادب چونکہ انسان کے رویوں اور نظریات کا عکاس ہوتا ہے چنانچہ یہ نظریات ان کی تحریروں میں بھی پیش کیے گئے جس سے معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے میں مدد ملی۔ اختر النسا بیگم میں نذر سجاد حیدر نے معاشرتی مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے اور ان معاشرے میں ان مسائل کے خاتمے کے لیے عملی کوشش اس ناول کی صورت میں ملتی ہے۔

۴.۱ صغر سنی کی منگنی کی مخالفت:

ہندوستانی معاشرے میں شادی کے معاملات میں لڑکے اور لڑکے کے اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے، پسند ناپسند تو دور کی بات ہے لڑکے اور لڑکی کی منگنی حتیٰ کہ نکاح بھی عمر کے اس حصے میں کر دیا جاتا تھا جب اسے زمانے سے واقفیت تو در کنار خود اپنی سدھ بدھ نہیں ہوا کرتی تھی اور وہ کھرے کھوٹے کی پہچان سے عاری ہوا کرتا تھا۔ ناول میں جہاں دیگر سماجی مسائل پیش کیے گئے ہیں وہاں صغر سنی میں منگنی کے مسئلے کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح بچپن میں کی جانے والی منگنیاں بعد ازاں ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی بنا پر عدم مطابقت کا باعث بنتی ہیں اور دو افراد کے ساتھ ساتھ خاندانوں کے درمیان مسائل کا باعث بنتی ہیں۔

۴.۲ شادی کے معاملات میں لڑکی اور لڑکے کی پسند:

شادی پوری عمر کا ساتھ ہے اور اس ساتھ میں لڑکا اور لڑکی ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کا سفر طے کرنا محال ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی دونوں کی پسندیدگی کا پوچھ لیا جائے تاکہ ان کے لیے یہ سفر خوشگوار ہو سکے اور وہ معاشرے کے بہتر فرد ہونے کے ناطے اپنے فرائض بطریق احسن سرانجام دے سکیں اور آنے والی نسلوں کی بھی بہتر تربیت کر سکیں۔ اسی موضوع کو احاطہ تحریر میں لاتے ہوئے

نذر سجاد حیدر نے اپنے ناول میں شادی کے معاملات میں لڑکی اور لڑکے کی پسند کے مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ہندوستانی معاشرے میں شادی کے معاملات میں لڑکی سے رائے لینا تو درکنار لڑکے کے اظہار کو بھی معیوب سمجھا جاتا تھا اور والدین کی مرضی سے تمام تر رشتے طے پاتے تھے۔جو بعد میں اکثر ناچاقی و بے سکونی کا باعث بنتے تھے۔ ناول میں ہندوستانی معاشرے کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

> "۔۔۔۔مس صاحبہ کو اس سے بہت ہمدردی تھی۔اختر کی شادی ان کو بالکل ناپسند تھی۔اور بہت سمجھاتی تھیں کہ "تم انکار کر دو" مگر اختر ہندستانی شرم کی پتلی تھی۔وہ ان کی اس قسم کی باتیں سن بھی نہ سکتی تھی۔اور کہہ دیتی تھی کہ "آپ اس باب میں کچھ نہ کہیں۔جو میرے والدین کو منظور ہے۔وہ ہوگا" (۱۹)

درج بالا سطور میں جیسے کہا گیا ہے کہ اس دور میں لڑکیوں کے ساتھ ساتھ لڑکوں کو بھی شادی کے معاملے میں آزادی رائے کا حق حاصل نہ تھا۔جرات اظہار کی کمی کی وجہ سے وہ اپنی زندگیاں اپنے والدین کے رحم و کرم پر جینے کے لیے مجبور تھے۔اس کی عکاسی ناول میں کی گئی ہے:

> "۔۔۔۔سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ ان لڑکوں کی اس جگہ اپنی مرضی بھی ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا ہی نہ ہو کہ "ماں باپ کا کیا سر پر دھرا" کے لحاظ سے لڑکے خاموش ہوں" (۲۰)

جس پدرسری معاشرے میں اختر جی رہی تھی وہاں کے معزز افراد جہاں معاشرتی رویوں کو بہتر بنانے اور استحصال کی جڑوں کو کمزور بنانے کے لیے دن رات کوشاں تھے وہاں ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہی معاشرتی جبر کا شکار ہوگئی اور اپنی زندگی انجان راستوں پر گزارنے کے لیے مجبور کر دی گئی اس کی مثال ذیل کی سطور میں ملتی ہے:

> "افسوس مجھے اتنا بھی معلوم نہیں۔کہ میں آج جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں۔وہ لوگ کون ہیں۔کہاں کے ہیں؟ کیسے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہوگی۔اس کی عادات ۔مزاج،اخلاق۔تعلیم۔عمر۔خیالات۔نام تک بھی تو مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔" (۲۱)

۴.۳ خوشی اور غمی پر کی جانے والی فرسودہ رسومات:

ناول میں نذر سجاد حیدر نے ہندوستانی معاشرے میں خوشی اور غم کے موقع پر کی جانے والی رسومات کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے جس کا مفصل بیان ذیل کی سطور میں ہے:

TH-26922

۴.۴ شادی پر کی جانے والی فضول رسومات:

اختر النسا بیگم میں نذر سجاد حیدر نے جہاں معاشرے کی اصلاح کا کام کیا وہاں اس میں مروجہ فضول رسوم ورواج کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا اوران کے نقصانات واضح کیے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس ناول میں نذر سجاد حیدر نے دو طبقات کا تقابل کرتے ہوئے مسائل کی عکاسی اوران کا حل پیش کیا ہے جس میں برتری پڑھے لکھے طبقے کو دی گئی ہے،اسی حوالے سے پڑھے لکھے طبقے کے نمائندہ مسٹر وقار کی شادی کی رسومات کے حوالے سے کی گئی بحث کو وہ یوں پیش کرتی ہیں:

> "میں اس شادی میں فضول رسومات مروجہ اٹھا دینی چاہتا ہوں اور یہی شادی ہماری برادری کے لیے نظیر قائم ہوگی۔اسی طرح جہیز میں بھی کمی کی جائے۔ سینکڑوں جوڑے کپڑے اور دیگر فضول چیزیں بالکل نہ ہوں گی"(۲۲)

اسی طرح اس زمانے میں بارات کے معاملے میں اگر دولہے کے ساتھ زیادہ براتی ہوتے تھے تو دلہن والے برامان جاتے تھے لیکن مسز وقار نے اس کی مزمت کرتے ہوئے کہا کہ:

> "مسز وقار: میں نے لکھ دیا ہے کہ اس خیال سے بہت سے آدمی ساتھ لانے کی فکر میں مت پڑنا کہ ہماری برات سے ہم خوش ہوں گے ۔ ہمیں ایسی فضول شیخی پسند نہیں ہے۔صرف اپنے رشتہ داروں اور چند عزیز دوستوں کو ساتھ لے آؤ تو کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔
>
> ۔۔۔میری تو رائے ہے کہ پہلے مہمانوں کو بالکل جمع نہ کیا جائے۔یہی تو فضولیات ہیں۔جن سے بہت سارو پیہ برباد ہو جاتا ہے۔۔۔"(۲۳)

علاوہ ازیں ناول میں نذر سجاد حیدر نے جن رسومات کا ذکر کیا ہے ان میں شادی سے کئی ہفتے قبل تمام تر رشتے دار اور اقربا کا ہجوم اور شور وغل جس سے وقت کے ساتھ ساتھ پیسے کا زیاں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

شادی سے مہینہ قبل گھر کی صفائی کے رواج جس میں سفیدی، قلعی، فرش بچھانا وغیرہم جیسے معاملات پر بحث کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان سب مسائل کا حل محض تعلیم نسواں میں پوشیدہ ہے اگر مستورات کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دیا جائے تو وہ ان مسائل میں الجھنے سے بچ جائیں گی۔

۴.۵ نتھ کا رواج:

ہندوستان میں جہاں قدیم فرسودہ رسوم رش بس گئی تھیں وہاں نتھ کا رواج بھی عام تھا اور اسے عزت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ خواتین کے ناک میں خاص طور پر چھید کروا کر اسے نتھ پہنادی جاتی تھی جو مرد کی عزت اور بالا دستی کو ظاہر کرتی تھی اور بعض لوگ اسے عورت کی محکومی سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور شادی کے وقت خاص طور پر عورت کے ناک میں نتھ پہنائی جاتی تھی تاکہ عمر بھر شوہر کی غلام و تابعدار رہے۔ اس حوالے سے نذر سجاد حیدر نے اپنے نظریے کی پیشکش یوں کی ہے:

> "مسز وقار: نتھ کے لیے جو انھوں نے پوچھا تھا۔ کہ کیا کروں؟ چند احباب کہتے ہیں کہ تمھیں تیار کرانی ہو گی۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ اس واہیات نشان بے عزتی و کنیزی کی ہمیں بالکل ضرورت نہیں۔ ہمارے یہاں ناک میں سوراخ کرانے کا بالکل دستور نہیں"(۲۴)

۴.۶ جہیز:

لڑکی کی شادی کے موقع پر والدین اپنی بیٹی کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے جہیز کے طور پر کچھ تحائف دیتے ہیں تاکہ نئے گھر میں جا کر اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنانہ کرنا پڑے اور اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں، اسلام میں وراثت میں لڑکی کا باقاعدہ حق رکھا گیا ہے اس کے علاوہ والدین پر کسی قسم کی زبردستی عائد نہیں ہے کہ وہ بیٹی کو بھاری جہیز دیں ہاں مگر لڑکی کی بہتر تعلیم و تربیت کو والدین کا فرض قرار دیا گیا ہے۔ جہیز کے حوالے سے خالد سیف اللہ رحمانی اپنی کتاب میں جہیز و تلک کی رسم کے متعلق رقم طراز ہیں:

> اسلام میں نکاح کی حیثیت ایک معاہدہ کی ہے جس میں مرد و عورت قریب قریب مساویانہ حیثیت کے مالک ہیں یعنی نکاح کی وجہ سے شوہر بیوی کا یا بیوی شوہر کی مالک نہیں ہوتی اور عورت اپنے خاندان سے مربوط رہتی ہے۔ والدین کے متروکہ میں تو اسکو لازماً حصہ میراث ملتا ہے۔ بعض اوقات وہ بھائی بہنوں سے بھی حصہ پاتی ہے۔ ہندو مذہب میں نکاح کے بعد عورت کا رابطہ اپنے خاندان سے ختم ہو جاتا ہے۔ شاستر قانون کی رو سے وہ اپنے خاندان سے میراث کی حقدار نہیں رہتی۔ اسی لئے جب لڑکی کو گھر سے رخصت کیا جاتا تھا تو اسے کچھ دان دیکر رخصت کیا جاتا تھا۔(۲۵)

ہندوستان میں مسلمان اور ہندو چوں کہ اکٹھے رہتے تھے اس لیے رسوم و رواج میں بہت سے رواج اور روسومات مسلمانوں نے ہندوؤں سے مستعار لیں جن میں سے ایک جہیز بھی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ

فرسودہ رسومات اس حد تک راسخ ہو گئی کہ لوگ اسے ضروری سمجھنے لگے اور سماج میں عزت کو برقرار رکھنے کی وجہ سے اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینے لگے۔مالی حیثیت سے اعلیٰ طبقات تو یہ رسم ادا کر لیا کرتے تھے لیکن معاشرے کے دیگر طبقات میں یہ رسم کسی مصیبت سے کم نہ ہے اکثر گھروں کی لڑکیاں اسی وجہ سے تمام عمر باپ کے گھر پر گزار دینے پر مجبور ہیں۔اور جو لوگ وقتی زیبائش اور معاشرے میں اپنا بھرم قائم رکھنے کی خاطر بھاری جہیز دے بیٹھتے ہیں ان کی عمر قرض چکانے میں صرف ہو جاتی ہے۔نذر سجاد حیدر نے بھی اپنے ناول میں اس رسم کے نقصانات کو مد نظر رکھا اور ہندوستانی رسوم ورواج کی عکاسی کی ہے۔نذر سجاد نے معاشرے کے مسائل کو ختم کرنے کے لیے اس رسم کے تمام تر مضر اثرات کو مد نظر رکھا اور پڑھے لکھے کردار کے ذریعے جہیز کے بارے میں کچھ یوں خیالات پیش کیے ہیں:

> "مسز ضیاالحسن: غیر شرعی رسومات پر عمل نہ کرنے سے گناہ سے بھی بچے۔۔۔۔
>
> لڑکی کے جہیز میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔۔۔۔وہی سامان دینا چاہیے جو ان کے کام آسکے"(۲۶)

اسی طرح شرعی طور پر شادی کی حمایت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> مسز وقار:۔۔۔اور سامان ہی ایسا کیا کرنا ہے۔کون سے بٹوے۔تلیدانیاں۔بوغبوند سلیں گے۔
>
> ۔۔۔میرٹھ کی بیگمات سے اگر میں نے مشورہ کیا تو وہ دو سو جوڑا اور ایک بٹوا تیار کرنے کا حکم دے دیں گی۔۔۔۔ہم تو یہ شادی نئے طریقے پر بالکل سیدھی سادی شرعی طور سے کرنا چاہتے ہیں۔"(۲۷)

۴.۷ بچے کی پیدائش پر کی جانے والی رسوم (گود بھرائی)

ہندوستانی معاشرے کی رسوم ورواج کی عکاسی کرتے ہوئے بچے کی پیدائش پر کی جانے والی لغو رسومات کو بھی پیش کیا گیا ہے جن کی تفصیل ذیل کی سطور میں ہے۔

۴.۸ چھٹی کی رسمیں:

بچے کی پیدائش کے چھٹے روز ہندوستانی بیبیاں پورے خاندان کو اکٹھا کر کے جو رسوم ادا کیا کرتی ہیں انھیں چھٹی کی رسمیں کہا جاتا ہے جس میں سے درج ذیل کو ناول میں پیش کیا گیا ہے:

۱۔ پلنگ سے اتار کر فرش پر بٹھانا۔۔۔اس دوران میں گود میں بچی کا ہونا کیوں کہ اگر بچی پہلی دفعہ زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے بچی گود میں نہ ہوئی تو اسے بدشگونی سمجھا جائے گا۔

۲۔ کھانا کھلانا۔۔۔۔۔ کھانا اس طرح کھلایا گیا کہ پہلے سات سہاگنوں (جن کی گود میں بچہ ہو) نے ہاتھ ڈال کر کھانا چکھا پھر ماں کو کھلایا گیا۔

۳۔ سہرا باندھنا۔۔۔۔ایک رسم بچے کے سر پر سہرا باندھنے کی بھی کی گئی۔

۴۔ گود بھرائی۔۔۔۔ سامان میں ناریل، بادام، چھوارے، کشمش، پستہ، کھلیں، بتاشے وغیرہ ہم بچی سمیت ڈالنا۔

ایک طرف تو قدیم رسومات کی دلدادہ خواتین اوران رسومات کی اہمیت کو سراہنے والی خواتین کے کے کردار پیش کیے گئے ہیں تو دوسری طرف مسز وقار کا کردار بھی پیش کیا ہے جو اپنی روشن خیالی کی وجہ سے ان تمام رسومات کے خلاف تھیں اور انھوں نے ان سے خود کو اور اپنے اہل خانہ کو بچار کھا تھا۔ اور وہ اپنی بیٹی تک کو ان رسو کی اجازت نہیں دیتی تھی جبکہ دوسرا طبقہ چھوٹے بڑے سمیت ان رسومات کا قائل تھا اور اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔

۴.۹ بیٹے کی پیدائش پر خوشی اور بیٹی کی پیدائش پر غم کا اظہار:

عموماً لڑکیوں کو پرایا دھن سمجھا جاتا ہے اسی لیے بیٹی کی پیدائش پر اکثر غمزدہ ہو جانا اور بیٹے کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کرنا ہمارا ایک عام معاشرتی رویہ ہے۔ ناول میں ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کے دوران بیٹے اور بیٹی کے افتراقات کو واضح انداز میں تو پیش نہیں کی کیا گیا لیکن کرداروں کی ذہنی کشمکش سے یہ تصور ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے کہ لوگ بیٹے کی پیدائش کو ہی باعث افتخار سمجھتے ہیں، ناول میں جانی بیگم کا کردار اس کی عملی مثال ہے وہ فرسودہ خیالات کی مالک تھی اپنی دوسری بیٹی کی پیدائش سے پہلے پر امید تھی کہ بیٹا ہوا تو خاندان کا نام اونچا ہو گا اور انھیں شوہر کی جائداد سے بھی حصہ ملے گا لیکن بیٹی کی پیدائش پر ان کے تمام ارمانوں پر پانی پھر گیا اور وہ اندر ہی اندر اداس بھی ہوئیں ۔ دوسری بیٹی کی پیدائش پر وہ بظاہر تو مسکرا رہی تھی اور نوبت بجوانے کا اہتمام بھی کیا (نوبت کا مفصل حال) لیکن اندر ہی اندر وہ سخت اذیت میں مبتلا تھی اس نے محض پڑھے لکھے خاندان میں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے نوبت بجوائی۔

"۔۔۔۔وہ وقت آیا جس کی لاکھ لاکھ ارمانوں سے بیگم صاحبہ منتظر تھیں۔ لیکن افسوس خلاف امید ظہور میں آنے سے ان کا دل بالکل بجھ گیا۔۔۔۔ انھوں نے ظاہر اً خوشی میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیا۔۔۔۔ لڑکی خبر باہر پہنچتے ہی نقارچیوں نے جو بیٹے کی خبر کے منتظر

تھے نوبت بجانا شروع کر دی۔ گو بیٹی کے ہونے پر دستور کے بموجب یہ باجا نامناسب تھا لیکن گھر سے بی امانی بیگم مغلانی کا حکم آیا تھا"(۲۸)

ناول میں نذر سجاد نے جہاں بچے کی پیدائش پر اظہار خوشی و غم کا ذکر کیا ہے وہیں اس پیدائش پر اظہارِ خوشی میں نوبت بجوانے کی رسم کو تعلیم یافتہ طبقے میں ناپسندیدگی کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ اس حوالے سے وکیل صاحب اور اختر کو محلے کے خوف سے شرمندہ دکھایا گیا ہے کہ محلے کے معزز لوگ اس حرکت پر کیا کہیں گے۔

۴.۱۰ خاندان کا وارث: بیٹا

ہندوستانی معاشرے میں بیٹے کی پیدائش کو قابل فخر سمجھا جاتا ہے اور اگر کسی کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہو جائے تو معاشرے کے دیگر افراد کے ساتھ ساتھ ماں بھی اس بات پر خائف رہتی ہے کہ میں اپنے شوہر کو خاندان کا وارث نہ دے پائی۔ اور بیشتر مرد تو بیٹے کی چاہت میں دوسری شادی بھی کر لیا کرتے ہیں تاکہ ان کا نام آگے چلانے والا نورِ چشم کوئی تو ہو۔ حالاں کہ یہ رویہ محض فرسودہ خیالات اور غلط سماجی رویوں کی پیداوار ہے۔ خدا نے دنیا میں کسی بھی شے کو بے مقصد تخلیق نہیں کیا۔ ایسے میں بیٹی کی پیدائش کو بوجھ تصور کرنا جہالت کے سوا کچھ نہیں۔ نذر سجاد حیدر نے اپنے ناول میں اس مسئلے کی عکاسی کرتے ہوئے ہمارے معاشرتی رویوں کی فرسودگی پر طنز کیا ہے اور یہ نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیٹا ہو یا بیٹی دونوں معاشرے کے باوقار فرد ہیں اور ہم کسی کو بھی محض صنفی تقسیم پر چھوٹا بڑا یا اہم یا غیر اہم نہیں قرار دے سکتے۔

"بعض ہندوستانی لوگوں کا خیال ہے کہ کم از کم ایک بیٹا ضرور ہونا چاہئے جو جائداد وغیرہ کا مالک ہو۔ اور جس سے نام چلے۔ جناب من یہ خیال محض فضول اور جاہلانہ ہے۔ اپنے بعد کی جائداد کو اخواہ کوئی مالک ہو۔ اس سے کیا فائدہ؟ بیٹا مالک ہو گا تو باپ کو ثواب پہنچے گا اور کسی غیر کے کام آیا تو گناہ ہو گا؟۔"(۲۹)

اسی طرح خاندان کا نام چلانے کی آرزو میں بیٹے کی خواہش بھی ایک عام تصور تھا بہت سے خاندان بیٹے کی خواہش اسی لیے کرتے تھے کہ ان کے بعد ان کا نام چلانے والا کوئی تو ہو۔ اس رویے پر نذر سجاد حیدر نے یوں تنقید کی ہے:

"نام چلانے کی آرزو ہی محض بے وقوفی ہے۔ فرض کرو بیٹا ہوا اور وہ زندہ رہا۔ پھر اس کے اولاد ہوئی۔ اور اس کی اولاد کی اولاد ہوئی تو یہ سلسلہ قیامت تک چلا جائے گا لیکن نام آوری کی آرزو رکھنے والے شخص کا نام کیاں سمجھیے کہاں تک باقی رہ سکتا ہے اور کون کون

اسے جانتا ہے؟ مجھے اپنے دادا مرحوم کے دادا کا نام بھی معلوم نہیں حالانکہ ان کی بھی خواہش ہوگی کہ میری نسل باقی رہے اور نام چلے۔"(۳۰)

۴.۱۱ بیوہ کے مسائل:

ہندوستان میں بیوہ کا کسی قسم کی آرائش وزیبائش کرنا غلط تصور کیا جاتا تھا بل کہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ شوہر کی وفات کے بعد عورت کا کھل کر جینا، ہنسنا کھیلنا، کسی بھی میدان میں آگے بڑھنا، پڑھنا لکھنا سب برا سمجھا جاتا تھا اور اس سے اس خوشگوار زندگی گزارنے کا حق چھین لیا جاتا تھا۔ لیکن اس ناول میں نذر سجاد حیدر نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہ عورت بھی اس کے غم میں دنیا کے رحم کرم پر خود کو چھوڑتے ہوئے مرقع غم والم بن جائے اور دنیا کے رحم وکرم پر جینا شروع کردے بل کہ اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو مضبوط بنائے اور معاشرے کی بجائے اپنے زور بازو پر بھروسا کرتے ہوئے زندگی کا سفر دوبارہ شروع کرے اور پر اعتماد شخصیت کے طور پر سر اٹھا کر جیے۔ اس دور کے معاشرے کی عکاسی درج ذیل سطور سے ہوتی ہے:

> "ابا جان زمانہ بہت برا ہے اور خصوصاً ان اطراف پر تو جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کان پور اور میرٹھ کے بہت سے مخالفین تعلیم نسواں میری بابت آپ کو بہت کچھ برا بھلا کہیں گے۔ اور بیگم صاحبہ تو غضب ہی ڈھائیں گی۔ جس کا مجھے از حد خیال ہے۔ مگر میں مجبور ہوں کہ سوائے قومی خدمت کے میری بسر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لیے عرض خدمت ہے کہ جو کوئی بھی آپ سے کچھ کہے آپ یہی کہ دیں کہ میری اجازت سے میری بیوہ لڑکی زنانہ سکولوں کی نگرانی کی خدمت انجام دے رہی ہے(۳۱)

غلط سماجی رویوں کی بنا پر جب اختر کو معاشرے میں رسوا کر دیا گیا تو اس وقت چچا کے گھر سے نکلتے ہوئے اس نے یہ عہد کیا کہ اب کسی کے رحم وکرم پر نہیں رہے گی بل کہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لیے سر گرم عمل ہو گئی اور ہندوستان کی پہلی بی اے خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ شعبہ تعلیم میں انسپیکٹر بھی بھرتی ہو گئی اور اپنی زندگی کو خود مختاری سے بسر کیا۔ اس کی مثال ذیل کی سطور میں ہے:

> "ابا جان اس حالت میں میں نے اتنا کچھ صرف اس خیال سے کیا کہ جب خدا نے مجھے پیدا کیا ہے تو دنیا میں بے کار ثابت نہ ہوں۔ اپنی ہستی کو کار آمد بنانے کے لیے اس قدر دقتیں اٹھائیں۔ ورنہ میرے دل میں حوصلہ اور مجھ میں ذرا ہمت نہ تھی۔ خدا کا لاکھ شکر ہے کہ آج میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔"(۳۲)

ایک طرف اختر النسا نے اتنی ہمت دکھائی کہ ایسے معاشرے میں جہاں خواتین کا گھر سے نکلنا اور تعلیم حاصل کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، اس نے بیوگی میں نا صرف اعلیٰ تعلیم کا حصول ممکن بنایا اور اس کے بعد نوکری بھی کی، بل کہ اس نظریے کی تردید بھی کی کہ عورت مرد کے بغیر ادھوری ہے۔ ایسے حالات میں اس نے تن تنہا جب خاندان کا کوئی دوسرا فرد اس کا معاون نہیں تھا اس نے اپنا سفر جاری رکھا لیکن ہندوستانی معاشرے میں رہ کر یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت کے ہندوستانی معاشرے میں بیوہ عورت کا وجود ہی ناقابل قبول تھا۔ اس لیے اختر نے اپنا نام تبدیل کر کے ستارا بائی رکھ لیا اور اپنا مذہب پارسی ظاہر کیا۔ تبدیلی کا یہ عمل معاشرتی جبر کی واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ عورت کو ان مجبوریوں سے بچنے کے لیے فرار کا راستہ اپنانا پڑتا ہے جو بعض اوقات اس کی مذہبی اقدار کو بھی مسخ کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن اس معاشرے میں مسلمان بیوہ کا گھر سے نکل کر سرگرم عمل ہونا اس قدر آسان نہیں اسی لیے اختر نے درمیان کا راستہ چنتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔

۴.۱۲۔ دوسری شادی کی مخالفت:

ہندوستانی معاشرے میں مرد کی دوسری شادی کا رواج اور رجحان دونوں بہت نمایاں تھے، پہلی بیوی کی وفات کے بعد تو شادی کرنا تو معمول تھا ہی لیکن کچھ افراد بیوی کے ہوتے ہوئے بھی تعدد ازدواج کا اشتیاق رکھتے تھے "اختر النسا بیگم" میں ایک سوتیلی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے ایسی لڑکی جس کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا اور والد کی دوسری شادی کے بعد سوتیلی ماں کے مظالم سے زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔ سوتیلی ماں کا رویہ بظاہر تو محبت بھرا تھا لیکن اندر کی حسد اور بغض کی وجہ سے وہ اسے نقصان پہنچانے سے نہ رہ سکی، ایک تو سوتیلی ماں اور دوسرا اس کی پہلے بھی ایک بیٹی تھی تو وہ اس لاڈلی بیگم کو ہمیشہ اختر سے بڑھ کر چاہتی اور اختر کے لیے ہمیشہ زندگی کے راستے پر چلنا مشکل کر دیا کرتی تھی۔ ناول میں نذر سجاد حیدر نے دوسری شادی کی مخالفت کرتے ہوئے اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل اور نقصانات بیان کیے ہیں۔ جس کی ایک مثال ذیل کی سطور میں ملتی ہے:

> "اختر: افسوس مجھے اتنا بھی معلوم نہیں۔ کہ میں آج جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں۔ وہ لوگ کون ہیں۔ کہاں کے ہیں؟ کیسے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہو گی۔ اس کی عادات۔ مزاج، اخلاق۔ تعلیم۔ عمر۔ خیالات۔ نام تک بھی تو مجھے نہیں معلوم۔ مجھے بیگم پر کچھ افسوس نہیں۔ وہ سوتیلی ماں ہے میرے ساتھ جو بھی کرے بجا ہے۔ ہائے افسوس تو پیارے ابا جان پر ہے انھوں نے مجھ پر ذرا رحم نہ کیا اور غیروں کی خوشی پر مجھے قربان کر دیا"(۳۳)

ناول میں اقبال بہادر کا کردار بھی دوسری شادی کی مخالفت کرتا نظر آتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رجحان ان پڑھ لوگوں میں زیادہ تھا اور پڑھے لکھے افراد اسے مسئلہ ہی سمجھتے تھے۔ اقبال بہادر نے وکیل صاحب کے تمام تر مسائل کی وجہ دوسری شادی کو قرار دیا ان کے مطابق وکیل کی ایک غلطی دوسری شادی تھی اور دوسری بڑی غلطی بنا تحقیق کے شادی تھی۔ وکیل صاحب نے محض اپنی بیٹی کے خیال سے دوسری شادی کر لی مگر وہ یہ بھول گئے کہ حقیقی ماں اور سوتیلی ماں میں بہت فرق ہوتا ہے انھوں نے دوسری بیوی کے رنگ میں ڈھلتے ہوئے اپنی بیٹی کو خود اپنے ہاتھ سے گنوا دیا اور پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی اور ان پڑھ بیوی کے کہنے پر اس کے مزاج سے مختلف لوگوں کے ہاں بیاہ دیا جو محض روپے پیسے کے لالچ میں اسے بیاہ کر لے گئے۔

ستارا جو کہ "اختر النسا" ہی ہے اس نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی بڑی وجہ اپنے والد کی دوسری شادی کو قرار دیا ہے کیوں کہ سوتیلی ماں کے آجانے سے اس کا اپنا گھر اپنا نہ رہا تھا اور وہ اس میں قیدیوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ ایک موقع پر جب اسے دوسری شادی پر اظہار خیال کا موقع ملا تو اس نے دوسری شادی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

> "ستارا: معاف کریں۔ آپ لوگوں میں دوسری شادی کا بہت برا رواج ہے۔ اسی کے سب برے نتائج ہیں۔
>
> مسز وقار: بے شک یہی وجہ ہے ہم خود اس کے قائل ہیں۔۔۔" (۳۴)

۴.۱۳ پردے کی بحث:

ہندوستانی معاشرے میں خواتین کے پردے کو ایک خاص کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور ہر گھر میں اس کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا یہاں محض جسم کا پردہ کا نہیں تھا بل کہ لڑکی یا عورت کی آواز کا بھی گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ خواتین کے نام تک کا پردہ رکھنے کے لیے لڑکیوں کے نام عموماً مردوں کے ناموں کی طرح کے رکھے جاتے تھے تاکہ اگر کسی کا نام باہر لیا جائے تو لڑکی یا لڑکے کی تخصیص نہ ہو سکے۔ معاشرہ چوں کہ مصنف کے ذہن اور تخلیقات پر اثر انداز ہوتا ہے اسی لیے نذر سجاد حیدر بھی اس کے اثر سے اپنا قلم بچا نہ سکی اور انھوں نے پردے کی مختلف صورتیں اور نوعیتیں اپنے ناول میں پیش کی ہیں۔

سب سے پہلے ناموں کے حوالے سے دیکھا جائے تو اختر النسا بیگم میں بھی لڑکیوں کے ایسے نام استعمال کیے گئے ہیں جو مذکر کے لیے مستعمل ہیں جیسے ناول کا مرکزی کردار اختر خود اور اس کی خالہ زاد بہنیں، نجم اور قمر ان

سب کے نام گرامر کے اعتبار سے مذکر ہیں لیکن یہاں "النسا" کا اضافہ کر کے انہیں لڑکیوں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔اسی طرح ناول میں مسز، بیگم اور اس طرح کے القابات کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ جیسے مسز وقار، مسز خورشید، مسز تجمل وغیرہم کا استعمال کیا گیا ہے، جس کا مقصود بھی شاید نام نہ لینے کی پابندی تھی۔

ناول میں ہندوستان کے جس معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے وہاں پردے کی اس حد تک پابندی تھی کہ ہر طبقے کی عورت پردے کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ پڑھی لکھی خواتین جو گھروں سے باہر جایا کرتی تھیں وہ بھی اس بات کا خاص خیال رکھتی تھیں کہ کسی غیر محرم سے کوئی گفتگو نہ ہو پائے۔ اگر گفتگو کرنا ضروری بھی ہوتا تو پردے کی اوٹ میں بات چیت کی جاتی تھی۔ اس کی مثال ذیل کی سطور میں ہے:

> ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ کہ اچھا ہم منظور کریں گے۔ کیا وہ لیڈی خود ہم سے اس بارے میں گفتگو نہیں کر سکتیں؟
>
> ماسٹر صاحب نے کہا کر سکتی ہے۔ اور اختر کو اطلاع دی۔
>
> کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ ادھر ڈاکٹر کھڑے تھے۔ اور ادھر اختر انگریزی میں دونوں کے بخوبی سوال و جواب ہوئے۔۔۔"(۳۵)

درج بالا اقتباس سے نذر سجاد حیدر نے اس دور میں پردے کی اہمیت کی عکاسی کی ہے لیکن یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان کرداروں کا تعلق جس دور سے ہے اس دور تک خواتین کے پردے کے رجحانات میں تبدیلی آگئی تھی۔ اگر ایک طرف عورت کا اونچی آواز میں بات کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا، دوسری طرف اسی معاشرے کی عورت کا غیر مرد سے کسی مصلحت اور مجبوری کے تحت مکالمہ کرنا ایک واضح تبدیلی کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ کہ اب حالات اتنے سخت نہیں رہے جتنے اس وقت تھے۔

اس دور کے ہندوستانی معاشرے کو دیکھا جائے تو ایک اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ اگر مسائل حد سے تجاوز کر جائیں اور معاملات بگڑنے لگیں تو ایسے میں پردے کو راہ کی رکاوٹ بنا کر بیٹھے رہنا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ نذر سجاد حیدر نے یہاں یہ تصور پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب حالات سازگار نہ ہوں تو ایسے میں پردے میں بیٹھ کر خود کو محتاج تصور کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی صورت میں انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرے تاکہ عزت نفس پر آنچ نہ آنے پائے۔ اس کی ناول میں یوں ملتی ہے:

"اب وہ سخت مجبور تھی، کوئی اس کا مددگار نہ تھا۔ اس لیے ایسے آڑے وقت میں وہ ہندوستانی پردہ قائم نہ رکھ سکتی تھی۔"(۳۶)

یہاں پردے کی پابندی کی وجہ سے گھر پڑے رہنا اور بیوہ کی ہندوستانی رسوم کی پابندی کرنا دونوں مراد ہیں۔ ناول میں نذر سجاد حیدر نے ہندوستانی معاشرے میں پردے کی پابندی کی بحث تفصیل سے کی ہے۔ مختلف کردار اس کی عملی مثال کے طور پر بھی پیش کیے ہیں لیکن اختر کا بیوہ ہونے کے بعد نوکری اور تعلیم کے لیے سرگرم عمل ہونا۔ اس وقت کی ہندوستانی رسومات سے بغاوت کرتے ہوئے گھر سے نکلنا خواتین کے لیے ایک مثبت محرک کے طور پر برتا گیا ہے۔ کیوں کہ محض سوگوار ہو کر زندگی کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا مسائل کا حل نہیں ہوتا۔ یہاں نذر سجاد حیدر نے ان معاشرتی عوامل سے بھی پردہ اٹھایا ہے جن کی وجہ سے اختر کو اپنی شناخت بدل کر بیوہ سے پارسی لیڈی بننا پڑا۔ یہ ہندوستانی معاشرے کے دوہرے معیارات ہیں جو ایک طرف بیوہ عورت کے لیے زندگی کے تمام دروازے بند کر دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف اسے پردے اور جبری پابندیوں سے بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیتے۔ ایسے ناموافق حالات میں اختر النسا کا اپنا نام، رہن سہن، شناخت اور معمولات زندگی کو تبدیل کر لینا نہایت جرات مندانہ قدم ہے۔

۵ قدیم اور جدید رویوں کا تصادم:

قدیم ہندوستانی معاشرے کے رسوم و رواج اور حالات و واقعات کو دیکھا جائے اور وہاں کے افراد کی ذہنی حالت کا اندازہ لگایا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کی راہ میں انسان ہی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے تانیثی مفکرین نے عورت کے استحصال کی وجہ مرد کا اپنی طاقت کا غلط استعمال کرتے ہوئے اس کے حقوق صلب کرنے کو قرار دیا ہے۔ اور یہ تصور واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواتین کے لیے جتنے بھی مسائل پیدا کیے گئے ہیں وہ مرد کے پیدا کردہ ہیں لیکن نذر سجاد حیدر نے اس ناول میں یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ محض مرد ہی عورت کا استحصال نہیں کر رہا اور اس پر تعلیم و ترقی کے دروازے بند نہیں کر رہا بل کہ یہ کام پورا معاشرہ سرانجام دے رہا ہے۔ اور محض عورت ہی نہیں بل کہ ہر انسان چاہے وہ مرد ہو یا عورت دونوں کے مسائل پیدا کرتے ہوئے راہ کی رکاوٹ بن رہا ہے۔

اختر النسا بیگم میں اس مسئلہ کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ محض مرد عورت کا استحصال نہیں کر رہا بل کہ جس کے پاس کچھ اختیارات ہیں وہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اور انسانیت کو مجروح کر رہا ہے۔ یعنی طاقت کے بل بوتے پر استحصالی طبقہ سرگرم عمل نظر آتا ہے اور معاشرتی بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ یہاں طاقت

کے ساتھ ساتھ اختیارات اور ذہنی صلاحیتیں بھی بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہیں کیوں کہ کوئی بھی حساس ذہن کبھی کسی کو ناحق تکلیف نہیں دے سکتا اور درد دل رکھنے والا شخص تو اس کا قیاس بھی نہیں کر سکتا۔

ناول میں قدامت پسند اور جدت پسند دو طرح کے نظریات کے حامل کردار پیش کیے گئے ہیں۔ جدت پسند کرداروں میں اختر اس کی خالہ کا گھرانہ اور والد شامل ہیں، دوسری طرف قدامت پرستی میں سوتیلی والدہ، بہن، سسرال کے تمام لوگ شامل ہیں۔ جدید اور قدیم دونوں اذہان ہم آہنگ نہ ہونے پر ایک عجیب الجھاؤ سے دوچار ہیں۔ ناول میں اسی کشمکش کی عکاسی کرتے ہوئے اختر کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے گئے ہیں جو اپنی سوتیلی ماں سے ذہنی مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے پریشانی کا شکار ہے اور اپنے مزاج اور تربیت کی وجہ سے ان سے الجھنے سے بھی گریزاں ہے، جب کہ اس کی سوتیلی ماں ہر لمحہ اسے ایذا پہنچانے کے درپے ہے اور اس کے لیے وبالِ جان بنی ہوئی ہے، یہاں اختر کی پریشانی اپنے ہی گھر میں امجان بن کر رہتا ہے اور ماں کی الجھن اسے نت نئے طریقوں سے الجھاتا ہے۔ دوسری طرف اختر کے والد (وکیل) صاحب علم ودانش ہونے کے باوجود اپنی دوسری بیوی سے الجھنے اور انھیں کچھ کہنے سے اس لیے بھی خائف ہیں کہ کہیں حالات میں مزید بگاڑ نہ پیدا ہو جائے۔ جب کہ اختر کی خالہ اور خالہ زاد بہن بھائی سوتیلی ماں کے مظالم کو محض اس لیے برداشت کرتے جاتے ہیں کہ ناسمجھ عورت جو ذہنی طور پر مطابقت نہیں رکھتی اس سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اختر کے شوہر ظفر کا کردار بھی اسی معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے جہاں وہ اپنی ماں کے فیصلوں کے آگے مجبور ہے اور اپنی زندگی میں اپنی مرضی کا کوئی رنگ بھرنے سے قاصر بھی ہے۔ ظفر کے ماں باپ نے اسے اپنے مفادات کی خاطر قربان کر دیا اور بعد میں بھی وہ ان کی مکاریوں کا نشانہ بنتا رہا۔ رہی بات اختر کی تو وہ ایک بن ماں کی بیٹی اپنی سوتیلی ماں کے ہاتھوں مظالم سہنے کو مجبور تھی یہاں وہ اپنی حکمت عملی کو کام میں لاتے ہوئے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتی تو کر سکتی تھی لیکن سوتیلی ماں نے یکے بعد دیگرے ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ اس جال میں پھنستی چلی گئی اور اپنے لیے کچھ نہ کر پائی۔ اختر النسا بیگم میں سماجی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے نذر سجاد حیدر لکھتی ہیں کہ:

> "افسوس دنیا بھی کس قدر بری جگہ ہے۔ اس میں کیسے کیسے جعل فریب ہیں۔ نہ معلوم ان بد باطنوں نے مل کر کیا جعل سازی کی ہے۔ کس بے بس معصوم کے درپے آزار ہیں۔ آہ اس بھولی بھالی لڑکی کو کچھ خبر نہیں کہ اس پر کیا ظلم ہونے والا ہے۔۔۔" (۳۷)

ناول میں نذر سجاد حیدر نے افراد کے ذہنی رویوں اور کشمکش کو بطور خاص موضوع بنایا ہوا اور یہ نظریہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے کے مسائل ذہنی ہم آہنگی اور باہمی محبت و احساس کے جذبے کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ناول میں کردار کے مسائل اور مشکلات کا ذمہ دار مرد کو نہیں ٹھہرایا گیا بل کہ یہ ذمہ داری معاشرے اور خاص کر اس طبقہ ءنسواں پر عائد کی جارہی ہے جو قدامت پرستی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے اور جدید روشنی سے زندگی کو سنوارنے سے عاری ہے۔ ناول میں عورت کو عورت کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا جارہا ہے بل کہ مرد بھی عورت کی وجہ سے مسائل سے دوچار نظر آتا ہے۔

اختر النسا بیگم کل ۲۴۵ صفحات پر مشتمل ہے اس میں نذر سجاد حیدر نے مختلف ابواب کی صورت میں نظریات کی پیشکش کی ہے، ناول کل تئیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں ہر باب کے آغاز میں موضوع کی مناسبت سے اشعار کا اندراج کیا گیا ہے جو پورے باب کا مرکزی خیال اور خلاصہ بیان کر دینے میں معاونت دیتے ہیں اختر النسا بیگم میں درج ذیل ابواب کے تحت نظریہ پیش کیا گیا ہے جس سے باب کے مندرجات کا مختصر تعارف بھی مل جاتا ہے۔

نمبر شمار	شعر	تفصیل
پہلا باب	شبنم کہیں گرائی کہیں گل کھلا دیا رویا کوئی کہیں تو کسی کو ہنسا دیا	رفیق منزل
دوسرا باب	قسمت میں گر لکھے تھے مری بیشمار رنج سنگریزہ ایک رکھ دیا ہوتا بجائے دل	
تیسرا باب	آدم سے باغِ خلد چھٹا۔ ہم سے اپنا گھر وہ ابتدائے رنج تھی یہ انتہائے رنج	وقار منزل
چوتھا باب	یاس ہی یاس ہے ارماں دلِ ویراں میں نہیں ایک سرسبز شجر میرے گلستاں میں نہیں	
پانچواں باب	جھونکے نسیم صبح کے آئے چلے گئے لیکن نہ اپنے دل کی شگفتہ کلی ہوئی	چھٹی کی تیاریاں
چھٹا باب	میرے نالوں سے ملا دیکھو فغانِ عندلیب ہو چمن میں آج مجھ سے امتحان عندلیب	
ساتواں باب	آج کیوں طرز تپش میں ہے تسلی کی ادا آج کے دن کوئی امید بر آئی میری	

آٹھواں باب	بات پھوٹی ہے چمن میں میرے مرجھانے کی نہیں امید یہاں آب وہوا پانے کی	کانپور
نواں باب	غم بھلا دیتے ہیں ہو اوروں کی محفل میں شریک یونہی تسکین دل زار کیا کرتے ہیں	
دسواں باب	گر خوشی دل کو ہوئی ساتھ ہی اک غم آیا عید آئی تو میں سمجھا محرم آیا	
گیارھواں باب	اب آرزوئے دل ہے کہ آنکھوں کو بچھاؤں جس وقت جہاں پر قدمِ رشکِ قمر ہو	خورشید لاج آگرہ
بارھواں باب	صد حیف نہ کچھ رحم کیا حال پر میرے غیروں کی خوشی پر مجھے برباد کیا	آغاز مصیبت
تیرھواں باب	وہ بھی ہوں گے کہ جو اس دہر میں شاداں ہوں گے ایک میں ہوں کہ میری شادی بھی بربادی ہے	شادی بربادی
چودھواں باب	سر پر آئی ہے بلا، لٹتی ہے، آزادی میری جس کو سب کہتے ہیں شادی ہے وہ بربادی میری	
پندرھواں باب	اب یہ ساری عمر کا رنج و غم کھانا مرا میری شادی تھی کہ تھا آفت میں پڑ جانا مرا	اختر النسا کا سسرال کانپور
سولھواں باب	موت آجائے کہیں ہو رنج و کلفت سے نجات تنگ مرغ روح اس زندانِ آب و گل میں ہے	امروہہ
سترھواں باب	ہائے وہ مرنا کسی کا چھوڑ کر تنہا مجھے اور دل کو تھام کر اف کہہ کے رہ جانا مرا	مرگ ناگہانی
اٹھارواں باب	اے خدا آسان کر مشکل کو جلدی رحم کر مجھ پر اب بھاری ہوئی جاتی ہے تنہائی میری	
انیسواں باب	گو ظلم کئے تو نے تھے پوشیدہ ستم گر پر رازِ نہاں چھپ نہ سکے کھل گئے آخر	قیصری باغ لکھنؤ افشائے راز
بیسواں باب	میں نہ کاشانے کے قابل ہوں نہ کاشانہ مرا	وکیل صاحب کی پشیمانی

	خانہ بربادی سے ہے آباد ویرانہ مرا	
اکیسواں باب	باب کا پہلا صفحہ موجود نہیں (ناقص نسخہ)	
بائیسواں باب	چھوٹتا ہے ہاتھ سے اب دامنِ صبر و قرار بے قراری سے بدلتی ہے شکیبائی مری	
تئیسواں باب	باب کا پہلا صفحہ موجود نہیں (ناقص نسخہ)	

ناول میں نذر سجاد حیدر نے مفرد و مرکب دونوں طرح کے جملوں کا استعمال کیا ہے اور بعض جگہ مکالماتی انداز بھی اپنایا گیا ہے۔ کرداروں کے مکالموں کے ذریعے ان کی ذہنی کیفیات اور نفسیاتی الجھنوں کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے جو نظریات کی تشکیل میں بہترین معاونت دینے کے ساتھ ساتھ ماحول کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ رویے فرد کی ذہنی کشمکش اور ماحولیاتی اثرات کا پتا بھی دیتے ہیں۔ جس سے قاری کی رسائی نظریے تک باآسانی ہو جاتی ہے۔ مکالمات کے علاوہ مصنفہ نے متن میں کرداروں کے باہم اشعار کا تبادلہ بھی بخوبی کیا ہے جس سے کردار کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا اندازہ بھی بخوبی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اختر نے جب بھائی اور بہنوں کے کہنے پر پیانو بجانا شروع کیا تو اختر نے ان اشعار سے شروع کیا:

؎ میرے نالوں سے ملا دیکھو فغانِ عندلیب

ہو چمن میں آج مجھ سے امتحانِ عندلیب

پھر اختر نے ایک اور جگہ ماں کی یاد میں یہ اشعار گنگنائے:

یاد آگیا وہ مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
اماں کی گودیوں میں وہ کھیلنا خوشی سے
ٹھنڈی ہوائیں پھر نا وہ تالیاں بجانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
اماں کا صبح اٹھ کر وہ میرا منہ دھلانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ
آزادیاں کہاں ہیں اماں کے وقت کی اب؟
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

درج بالا اشعار سے اختر کے اپنی ماں کے حوالے سے جذبات کی ترجمانی کھل کر ہو جاتی ہے، پورے ناول میں اختر النسا کے تمام تر مسائل کی وجہ اس کی سوتیلی ماں کا ناروا سلوک اور اس کے لیے شدید رویے ہیں۔ اور اس نے اختر کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھا، اس بات کا اعتراف وہ اکثر و بیشتر کیا کرتی تھی۔ درج بالا سطور کی اختر کی قلبی کیفیات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے اور اس کے اندر کا درد محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ناول میں نذر سجاد حیدر نے تقابلی انداز اپناتے ہوئے پڑھے لکھے اور ان پڑھ افراد کے رویوں کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے سادہ جملوں کا استعمال کیا ہے۔ ناول میں دو طبقات کی نمائندگی کے لیے مصنفہ نے دونوں طبقات کے زبان و بیان سے ہم آہنگ الفاظ کا ستعمال ہی کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی پڑھا لکھا کردار بات کر رہا ہو تو اس کے لیے ایسے الفاظ کا چناؤ کیا گیا ہے جس سے اس کی علمیت ظاہر ہوتی ہے اور ان پڑھ کردار کے لیے اسی کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ شادی کے حوالے سے بیگم کے خیالات کو نذر سجاد حیدر نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

> "وہ کہتا ہو گا بیٹی کو لیے بیٹھے ہوں گے۔ ایک دفعہ کہنے میں دھکیل دی۔ برسوں پیغام سلام ہوا کریں ہیں۔ مہینوں آدمی آویں جاویں ہیں۔ یہ مثل مشہور ہے کہ اتنے پھیرے کرے کہ جوتی اور کپڑت پھٹ جائیں تب ہم جواب دیں گے "(۳۸)

اس اقتباس سے بیگم کی ذہنی سطح کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے اور اس کی زبان و بیان سے بھی آگہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں نذر سجاد نے مندرجہ بالا اقتباس میں ضرب المثل کا استعمال بھی کیا ہے جس سے اس دور کی عام بول چال کی زبان اور ذہنی رویوں کا علم بھی بخوبی ہو جاتا ہے۔

نذر سجاد حیدر نے تاثر کو ابھارنے کے لیے رموز و اوقاف کا با قاعدہ استعمال کیا ہے اور ناول میں جہاں کہیں "سکتہ" کی علامت کا استعمال مقصود ہو تا وہاں "+" کی علامت کا استعمال جملے کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔ جیسے

> "یہاں کوتوالی کے قریب معمولی سے دو مکان ہیں۔ ایک مکان میں بڑا بھاری املی کا درخت کھڑا ہے۔ اور دوسرے میں بیری+بیری والا مکان بڑا ہے۔"(۳۹)

ناول میں نذر سجاد حیدر نے ناول کے فنی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے منظر کشی بھی کی ہے جس سے شدت تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے:

> "املی والے چھوٹے مکانوں میں صرف ایک کھلے دروں کا اچھا برا دالان ہے۔ اور بغلوں میں چھوٹی چھوٹی دو کوٹھریاں۔ اس کے آگے بھی چبوترہ ہے مگر بالکل ٹوٹا ہوا۔ دالان کے آگے کی اونچائی سے پایا جاتا ہے کہ کسی زمانہ

میں یہاں بھی چبوترہ بنایا گیا ہوگا۔ دالان کے سامنے ہی ایک چھپر ہے۔ جس میں چولہوں کا ہونا بتارہا ہے۔ کہ یہی باورچی خانہ ہوگا۔ نیچی نیچی کچی دیواروں کا ایک پاخانہ تو ہے۔ مگر غسل خانہ نہیں۔ اس مکان میں بیٹھک تو کیا۔ ڈیوڑھی کی کوٹھری بھی نہیں صحن کا دروازہ سڑک پر کھلتا ہے۔ املی اس قدر گھن دار ہے۔ جس نے چھوٹے سے صحن پر چھت ڈال رکھی ہے۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں تو کیا صحن میں بھی ہوا کا گزر تک نہیں ہوتا۔(۴۰)

ناول میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ کردار کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کی عکاسی کے لیے تقابلی انداز اپنایا ہے اور ناول میں بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے تعلیم کی اہمیت کے نظریے کو پروان چڑھانے اور تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی عملی کوشش کی گئی ہے۔ ناول میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک مثال کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے جو بیٹی اور باپ کے باہمی مکالمے پر مشتمل ہے۔ وکیل صاحب کا اپنی پڑھی لکھی بیٹی اور ان پڑھ بیوی کی زبانی مسئلہ کی کہانی سن کر ردعمل ت ظاہر کرنا اور تعلیم کی اہمیت کو سراہنا ہے۔

ناول میں اختر النسا کو ایک کمزور کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جو اپنی سوتیلی ماں کے ہوتے ہوئے اپنی زندگی میں اپنے لیے کسی بھی قسم کا فیصلہ لینے سے قاصر ہے، اس لیے ناول میں اس کی کمزوری اور بے بسی کو بار بار بیان کیا گیا ہے جس کے لیے اسے بیچاری، غریب، بد نصیب جیسے القابات سے پکارا گیا ہے۔ علاوہ ازیں شوہر کی وفات کے بعد اسے خصوصی طور پر بیوہ لکھا گیا ہے جس سے اس کردار کی معاشرتی حیثیت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان رسوم کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو غلط ذہنی رویوں کی پیداوار ہیں۔ اختر کے حالات وواقعات اور اس کی بے بسی اور مجبوری کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"اختر: افسوس مجھے اتنا بھی معلوم نہیں۔ کہ میں آج جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں۔ وہ لوگ کون ہیں۔ کہاں کے ہیں؟ کیسے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہوگی۔ اس کی عادات۔ مزاج، اخلاق۔ تعلیم۔ عمر۔ خیالات۔ نام تک بھی تو مجھے نہیں معلوم۔ مجھے بیگم پر کچھ افسوس نہیں۔ وہ سوتیلی ماں ہے میرے ساتھ جو بھی کرے بجا ہے۔ ہائے افسوس تو پیارے ابا جان پر ہے انھوں نے مجھ پر ذرا رحم نہ کیا اور غیروں کی خوشی پر مجھے قربان کردیا"(۴۱)

ناول میں جہاں کہیں کرداروں کے نام آئے ہیں ان کے ساتھ ان کی تعلیمی قابلیت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہ اس دور کا خاص طرز تھا کہ جو شخص جتنی بھی تعلیمی قابلیت اور عہدہ رکھتا تھا اس کے نام کے ساتھ اس کا اضافہ ضرور کیا جاتا تھا جیسے ناول میں وکیل صاحب، جج صاحب، لیڈی ڈاکٹر، ڈاکٹر خورشید وغیرہ جیسے القابات کا اندراج بہت زیادہ کیا گیا

ہے جس سے پڑھے لکھے کرداروں کی قابلیت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔القابات کے ساتھ ساتھ کرداروں کی تعلیمی ڈگریوں کا مذکور بھی کیا گیا ہے جیسے مسٹر رفیق احمد بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی اس کی ایک مثال ہے۔

ناول میں عورت کا نام لکھا جانے کی بجائے جگہ جگہ اس کے ساتھ مسز، بیگم وغیرہ جیسے القابات کا اضافہ کیا گیا ہے۔عورت کو اس کے اصل نام سے بہت کم پکارا گیا ہے جس سے اس دور کے پردے کی پابندی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نذر سجاد بھی پردے کی پابندی کی قائل تھیں۔

درج بالا تمام تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ اختر النسابیگم کو خاص مقاصد کے تحت تصنیف کیا گیا ہے۔ناول میں سب سے زیادہ اہمیت فروغ تعلیم نسواں کو حاصل ہے۔مصنفہ نے لڑکیوں کی تعلیم میں رکاوٹ کی ایک بڑی وجہ معاشرے کو قرار دیا ہے اور اس میں بھی خاص طور پر وہ طبقہ خواتین جو پڑھا لکھا نہیں ہے،وہ خواتین کی کامیابی کے راستے میں اپنی تنگ نظری کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل پیدا کرتا ہے۔نذر سجاد نے یہاں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ معاشرے کی ترقی اور ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ خواتین کو تعلیم دلوائی جائے تاکہ وہ شعور و آگہی کی وجہ سے اپنے اور دوسروں کے لیے مسائل پیدا کرنے سے بچ جائیں اور معاشرہ بہتری کی طرف گامزن ہو۔تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے نذر سجاد نے پڑھے لکھے اور ان پڑھ کرداروں کے مابین افتراقات و خصوصیات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ناول میں تعلیم یافتہ کردار معاشرے میں بہتر فرد کی حیثیت سے اپنا کردار نبھاتے ہوئے پیش کیے گئے ہیں اور ان پڑھ کردار مسائل کو جنم دے رہے ہیں۔نذر سجاد حیدر نے تعلیم نسواں کے فروغ کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دیگر مسائل کی اصلاح کی کوشش بھی کی ہے،جس میں تعلیم کے ذریعے شعور دلوانے کے ساتھ ساتھ فرسودہ رسوم ورواج کے خاتمے کی تحریک سر فہرست ہے۔نذر سجاد کے مطابق معاشرہ انسان کے ذہن و فکر پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی ترتیب میں فرد کا سب سے بڑا ہاتھ بھی ہوتا ہے اس لیے فرد کو چاہیے کہ وہ معاشرے سے ان قدیم رسومات کو بے دخل کردے جو اس کے وقت اور روپے کا زیاں کرنے کے ساتھ ساتھ فرد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں ان میں سر فہرست بچپن کی شادی اور منگنی ہیں،نذر سجاد کے مطابق بچپن کی منگنی انسانی ش پر ناگوار اثرات کی ایک وجہ بن جاتی ہے۔اس کی بڑی وجہ میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی نہ ہونا ہے یعنی یہاں یہ نظریہ پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شادی میں لڑکے اور لڑکی کی پسندیدگی کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر ان کی ذہنی مطابقت ہوگی تو زندگی خوشگوار ہوگی ورنہ وہ دونوں آپس میں الجھتے ہوئے زندگی گزار دیں گے اسی مسئلے کو شادی کے معاملے میں لڑکے اور لڑکی کی پسند کے مضمون میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

نذر سجاد نے ہندوستانی معاشرے میں خوشی اور غم کے موقع پر ادا کی جانے والی بے جا رسومات پر تنقید کی ہے اور انھیں فضول قرار دیا ہے۔ اس میں انھوں نے خاص طور پر جہیز جیسی معاشرتی برائی کو موضوع بنایا ہے۔ غم کے موقع پر بیوہ کی زندگی کے حالات و واقعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور یہ نظریہ ترتیب دیا گیا ہے کہ بیوہ عورت کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا مکمل حق حاصل ہے معاشرہ اس سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔ یہاں پدر سری معاشرے کے اس نظام کی خلاف ورزی کی گئی ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا اور کردار کے ذریعے اس کی عملی مثال بھی پیش کی گئی ہے۔ ناول میں بیٹے اور بیٹی کے درمیان روا رکھی جانے والے فرسودہ نظام کو بھی ہدف تنقید بنایا گیا ہے اور اسے جہالت اور ان پڑھ لوگوں کی خام خیالی کے علاوہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہاں بیوہ کا نوکری کرنا پدر سری معاشرے کے ان بندھنوں کو توڑنا تھا جو صدیوں سے بندھے چلے آ رہے تھے لیکن یہاں بھی نذر سجاد مکمل طور پر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو پائی۔ اور ان کے ناول کے کردار اختر النسا بیگم بھی بیوگی میں سادہ لباس پہننے کو ترجیح دیتی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کے حصول کے لیے مسلمان لڑکی کا خود کو پارسی ظاہر کرنا اور اپنا نام اور لباس تبدیل کرنا بھی دو ایسے عمل تھے جو بظاہر تو اس دور کے معاشرتی رجحانات کے خلاف جا رہے تھے۔ لیکن اب بھی کہیں کہیں اس کے حصار میں تھے۔

ناول میں ایک اور موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ برائی کا دورانیہ طویل نہیں ہوتا۔ اختر پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والی سوتیلی ماں اور بہن اسے اس کے اپنے گھر سے بے دخل کرنے اور باپ کو بیٹی سے مصلحتاً دور کرنی والی خواتین یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ شاید یہ عیش و عشرت ہمیشہ ان کا مقدر رہے گا اور وہ کبھی اپنے بچھائے ہوئے جال میں نہ پھنسیں گی، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ خدا نے نیک اعمال کا بدلہ نیکی اور بداعمالی کا بدلہ بدی میں رکھا ہے جسے مکافاتِ عمل بھی کہا جاتا ہے، تو ہوا بھی یوں کہ خلق خدا پر ناحق ستم ڈھانے والے دشمنان کی خوشی کی عمر لمبی نہ ہوئی اور وکیل (والد اختر) کو جلد ہی اپنی دوسری بیوی کی حرکات و سکنات کا علم ہو گیا کہ کس طرح طمع میں مبتلا ہو کر وہ ان کے گھر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی اور بیٹی اور باپ میں دوریاں پیدا کر رہی تھی۔ آخر کار وہ اپنے بنے ہوئے جال میں خود پھنسی اور گھر چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ یعنی اسے اپنے بسے بسائے گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ دوسری طرف بیگم نے اپنی لاڈلی بیٹی کی شادی بڑے شوق سے اپنی سہیلی کے بیٹے سے رچائی تو وہ بھی اپنی بداخلاقی کی وجہ سے زیادہ دن خوشی کے بسر نہ کر سکی اور بے سکون ہو گئی۔

یہاں ایک اور حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ جس انسان میں احساس اور ہمدردی کا فقدان ہو وہ کبھی دوسروں کی بھلائی اور مفاد نہیں سوچ سکتا۔ اختر النسا بیگم کی سوتیلی ماں اپنے تمام تر حالات و واقعات سے پردہ اٹھ جانے کے باوجود بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتی بچا کچا سامان لے کر فرار ہو گئی کیوں کہ جو انسان مادیت پرست ہو جائے اسے کسی سے

کوئی سروکار نہیں رہتا۔ پردے کے حوالے سے بات کی جائے تو یہاں بھی مصنفہ نے معاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے لیکن ابھی بھی قدیم روایات کی گرفت مضبوط ہے یہی وجہ ہے کہ کردار کہیں تو آزاد گھوم رہے ہیں اور کہیں پردے کی اوٹ میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

اس دور میں عورت کو محکوم سمجھا جاتا تھا اور مرد کو عورت کے راستے کی رکاوٹ گردانہ جاتا تھا لیکن اس ناول کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عورت کے راستے کی رکاوٹ محض مرد نہیں ہے بل کہ پورا معاشرہ ہے۔ مرد اور عورت دونوں استحصالی قوتوں کو پنپنے کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے جبری قوتیں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ ناول میں عورت کو ایک مضبوط کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جو کہیں مسز وقار کی صورت میں اپنے فرائض کو حسن اخلاق سے سرانجام دے رہی ہے تو کہیں اختر النسا کی صورت میں تمام تر مسائل پر قابو پاتے ہوئے حالات و واقعات سے لڑ کر اپنی زندگی کو صحیح ڈگر پر لے جانے اور معاشرے میں پدر سری نظام کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہونے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف منفی رویوں کو پروان چڑھاتی اختر النسا کی سوتیلی ماں اور ان کی بیٹی لاڈلی بیگم کے کردار نظر آتے ہیں۔ جو معاشرے میں شر کو فروغ دینے اور محض اپنے مفادات اور خواہشات کی تسکین کے لیے اپنے شوہر تک کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتی۔ یہاں ان تمام عورتوں کی طاقت اور اقتدار کو موضوع بنایا گیا ہے کہ عورت بھی معاشرے کا ایک اہم فرد ہونے کے ناطے بہر حال اختیار رکھتی ہے۔

مختصراً دیکھا جائے تو نذر سجاد نے اختر النسا بیگم میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی پیش کی ہے جو بظاہر تو حالات کے ہاتھوں مجبور ہے لیکن وقت آنے پر وہ اپنے علم و فن کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی مشکلات پر قابو پا لیتی ہے اور معاشرے کا ایک باوقار فرد بن کر ابھرتی ہے۔ یہاں خواتین کی قوت فیصلہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے کہ خواتین بھی اپنے فیصلے خود لے سکتی ہیں اور معاشرے کے فعال رکن کے طور پر خود کو منوا لیتی ہیں۔ نذر سجاد نے پدر سری نظام کی تردید کی ہے اور عورت کو اس کے حقوق دلانے اور عورت کو اس کے حقوق کی خاطر اٹھ کھڑے ہونے کی تحریک دی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جاوید اختر، ڈاکٹر، سید، اردو کی ناول نگار خواتین(ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک)،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷)، ص ۳۷۔

۲۔ حمیرہ سعید، ڈاکٹر، اردو ناولوں میں نسائی حسیت،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹)، ص ۶۵۔

۳۔ نسیم آرا، ڈاکٹر، اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ،(پاکستان: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸)، ص ۲۱۱۔

۴۔ احمد پراچہ، پاکستانی اردو ادب اور اہل قلم خواتین،(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۰)، ص ۲۰۳۔

۵۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر۔(۲۰۰۳)۔ پاکستانی اہل قلم خواتین۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۶۵۔

۶۔ حمیرہ سعید، ڈاکٹر، ص ۶۶

۷۔ ایضاً۔ ص ۶۷

۸۔ نذر سجاد حیدر، اختر النسا بیگم،(لاہور: دار الاشاعت پنجاب، ۱۹۲۵)، ص ۸

۹۔ ایضاً۔ ص ۱۰۰

۱۰۔ ایضاً۔ ص ۲۳۶

۱۱۔ کے کے کھلر، اردو ناول کا نگار خانہ،(دہلی: سیمانت پرکاش، س ن)، ص ۸۷

۱۲۔ نجم السحر اعظمی، علامہ راشد الخیری: شخصیت اور ادبی خدمات،(دہلی: ادارہ بزم خضر راہ، ۲۰۰۰)، ص ۳۵

۱۳۔ نذر سجاد حیدر، ص ۲۰۴-۲۰۵

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۲۳۶

۱۵۔ جاوید اختر، ڈاکٹر، سید، ص ۳۴

۱۶۔ نذر سجاد حیدر، ص ۱۵۸

۱۷۔ایضاً۔ص ۱۴۲

۱۸۔ترنم ریاض(مرتب)بیسویں صدی میں خواتین کا ادب۔(دہلی:ساہتیہ اکادمی،۲۰۰۴)،ص۱۰

۱۹۔نذر سجاد حیدر،ص۱۰۶

۲۰۔ایضاً۔ص۵۶

۲۱۔ایضاً۔ص۱۰۴

۲۲۔ایضاً۔ص۷۰

۲۳۔ایضاً۔ص ۷۲،۷۱

۲۴۔ایضاً۔ص ۷۲

25.https://ur.wikipedia.org/wiki/جہیز,Saturday, April 29, 2017,7:15 pm

۲۶۔نذر سجاد حیدر،(۱۹۲۵)۔ اختر النسا بیگم۔ص۸۵،۸۴

۲۷۔ایضاً۔ص۶۷

۲۸۔ایضاً۔ص۳۱،۳۰

۲۹۔ایضاً۔ص۱۸۴

۳۰۔ایضاً۔ص۱۸۴

۳۱۔ایضاً۔ص۱۷۹

۳۲۔ایضاً۔ص۲۳۲

۳۳۔ایضاً۔ص۱۰۴

۳۴۔ایضاً۔ص۲۲۰

۳۵۔ایضاً۔ص۱۶۴

۳۶۔ایضاً۔ص۱۷۶

۳۷۔ایضاً۔ص۶۵

۳۸۔ایضاً۔ص۷۴

۳۹۔ ایضاً۔ ص ۶۲

۴۰۔ ایضاً۔ ص ۶۳

۴۱۔ ایضاً۔ ص ۱۰۴

باب سوم:

عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا ارتقا

باب سوم:

عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا ارتقا

ناول نگاری کے ابتدائی دور میں معاشرے کے خارجی معاملات اور مسائل کو موضوع بنایا گیا اور اس میں فرد، بالخصوص خواتین کی تعلیم و ترقی کی طرف توجہ دی گئی اور ایسے ناول تخلیق کیے گئے جن میں معاشرتی اعتبار سے ایک اچھی اور بری عورت کا تصور دیا گیا۔اس دور میں تمام مصنفین کی توجہ چونکہ معاشرتی اصلاح کی طرف مبذول تھی اس لیے ایسے ہی موضوعات سے متعلق ناول تخلیق کیے گئے جن میں خارجی عوامل کی پیشکش کی جاسکے۔ اردو ادب کے ترقی یافتہ دور میں شامل ہوتے تک ادب میں ایسے موضوعات آچکے تھے جن میں محض خارجی عوامل کا مذکور نہیں تھا بل کہ حالات و واقعات کے انسانی زندگی پر اثرات ، انسان کی نفسیاتی کشمکش اور جنسی معاملات و مسائل سے متعالقہ موضوعات پر بھی لکھا گیا۔

اردو ناول کے اولین دور میں جو بھی ناول لکھے گئے ان میں فنی و فکری اعتبار سے جھول اور کمزوریاں موجود تھیں۔ چونکہ اس دور میں ناول کا مقصود محض معاشرتی اصلاح کا پہلو تھا۔اس لیے بہت سے مصنفین نے محض عورتوں کی سماجی حیثیت کو بطور خاص موضوع بنایا۔ جس میں بہت سی خواتین نے بھی اپنی خدمات سر انجام دیں۔ لیکن ان ناولوں میں عورت کو "اچھی" یا" بری" عورت کے طور پر ہی پیش کیا گیا ہے۔ایسی عورت جس کے پاس معاشرتی دباؤ اور الجھنوں کو سہہ لینے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہوتا یا وہ اتنی کمزور ہیں کہ اپنے لیے کسی بھی قسم کا فیصلہ لینے سے عاری ہیں۔ لیکن عصمت نے اپنی تحریروں میں ایسی عورت کی پیشکش کی ہے جو نا صرف دیرینہ رسومات اور معاشرتی دباؤ سے انحراف کرتی نظر آتی ہے بل کہ اس میں اتنی طاقت موجود ہے کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرے اور بعض اوقات تو مردوں کو بھی کٹھ پتلی کی طرح نچانے کا فن جانتی ہو۔یعنی اس طرح عصمت چغتائی نے معاشرتی جبر سے انحراف کرتے ہوئے عورت کو ایک مضبوط کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔

جس دور میں عصمت نے اپنی تحریری سرگرمیوں کا آغاز کیا وہ دور مرد کے لیے بھی جنسی مضامین پر بے باک لکھنے کے لیے سازگار نہیں تھا۔ عصمت نے ایسے معاشرے میں جنسی مضامین کو موضوع بنایا جہاں عورت کی آواز کو

چار دیواری تک محدود رکھنے کو پسند کیا جاتا تھا۔ عصمت نے نا صرف جنسی مضامین کو بل کہ ایک عورت کی طرف سے اظہار ذات اور اس کی نفسیاتی کشمکش کا بہترین اظہار کیا۔ جس سے اردو ناول کے نسائی کرداروں کا ارتقا سامنے آتا ہے۔اردو ناول میں عصمت سے پہلے عزیز احمد ایک ایسا نام نظر آتا ہے جنھوں نے اپنے ناول " شبنم "میں ایسے موضوعات کی پیشکش کی اور عورت کے مستحکم کردار کو پیش کیا۔ لیکن خواتین ناول نگاروں میں یہ کمال عصمت ہی کا ہے کہ انھوں نے مضبوط اور بے باک کردار کی پیش کش کی۔ معاشرتی صورتحال کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک عورت کے لیے عورت کی نفسیاتی کشمکش اور جنسی معاملات کا بیان ایک بڑا کام تھا۔ عصمت نے تخلیقی ادب میں افسانہ نگاری، ناول نگاری، مضمون نویسی اور خاکہ نویسی کی ہے۔اور ان تمام تخلیقات کو ان کے موضوعات اور اچھوتے پن نے قاری کی توجہ کا مرکز بنایا۔ عصمت چغتائی کے افسانوں کے موضوعات کے حوالے سے فضیل جعفری یوں رقم طراز ہیں:

"عصمت بنیادی طور پر سماجی مسلکات کی افسانہ نگار ہیں۔ دولت کی غلط تقسیم اور اس کے مضر اثرات، تقسیم سے پہلے کے بھرے پڑے مشترکہ خاندانوں کی چہل پہل اور قصباتی زندگی کے بیشتر ثقافتی پہلوؤں کی عکاسی، تقسیم کے بعد ابھرنے والی شہری زندگی اور ان میں پایا جانے والا تصنع، نیز اقدار کا پروردہ امارت و غربت کے بیچ ایسی خلیج جو ہماری حس انصاف کو ہی نہیں بل کہ جمالیاتی احساس کو بھی زخمی کر دے، ناکردہ گناہوں کی سماجی سزائیں، عورت کا مرد کی ملکیت تصور کیا جانا، بند سماج میں موجود جنسی دباؤ اور بعض اوقات اس کی غیر فطری نکاسی بہتر تعلیم کی کمی، ذاتی سطح پر مفادات کا گھنا جنگل اور معاشرے میں موجود رکاوٹیں وغیرہ عصمت کے افسانوں کے عمومی موضوعات ہیں(۱)

عصمت چغتائی کے ناولوں میں ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی، دل کی دنیا، ایک قطرہ خوں، وغیرہم شامل ہیں۔ "عصمت کے ناولوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کا خاص سبب ان کی زبان کا جادو ہے، فن کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ٹیڑھی لکیر ان کا سب سے کامیاب ناول ہے"۔(۲)

زیر نظر تحقیق عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر پر کی گئی ہے۔ جو ۱۹۴۴ میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا۔ یہ تحقیق ناول ٹیڑھی لکیر کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے جس میں ناول کے متن کا مشاہدہ کر کے اس میں عصمت کے پیش کردہ نظریات کا جائزہ لیا جائے گا اور ناول میں نسائی کرداروں کی پیشکش کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔ ٹیڑھی لکیر پر مفصل بحث ذیل کی سطور میں کی گئی ہے:

ناول کا عنوان ٹیڑھی لکیر ہے اور مرکزی کردار شمن ہے اور ناول اسی کی ذات کے ٹیڑھے پن کی وضاحت کرتا ہے۔ اسے ایک طرح سے سوانحی ناول بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ناول میں شمن کی پیدائش سے لے کر ایام جوانی اور اس کے بعد اس کی شادی کے بعد کے مسائل کو اس باریکی اور مہارت سے بیان کیا ہے کہ اس کی زندگی

کھلی کتاب کی صورت سامنے آجاتی ہے نا صرف زندگی کے ظاہری پہلو بل کہ اس کی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کشمکش کا اظہار بھی کمال مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر یوسف سرمست یوں رقم طراز ہیں:

"یہ ناول سوانحی انداز کا ہے۔اس میں ایک کردار کا مطالعہ بچپن سے جوانی تک اس تفصیل سے اور گہری نظر سے کیا گیا ہے کہ اردو ناول میں اس کا جواب نہیں ملتا۔اس طرح بچپن سے جوانی تک اردو ناول میں کسی بھی کردار کا مطالعہ اتنی تفصیل سے اور اس قدر نفسیاتی ژرف نگاہی سے نہیں کیا گیا تھا۔اس ناول میں بھی اس دور کے بہت سے ناولوں کی طرح صرف شمن کے کردار کی اضافت سے ناول کے پورے واقعات اور کردار ابھارے گئے ہیں۔ٹیڑھی لکیر میں آپ بیتی کا عنصر بے حد غالب ہے بل کہ یہ خود عصمت کی ان کی اپنی زندگی پر استوار ہوا ہے۔(۳)

ناول ٹیڑھی لکیر میں عصمت چغتائی نے مشرقی تہذیب کی عکاسی کی ہے اور اس میں خاص طور پر عورت اور اس کے نفسیاتی و جنسی مسائل اور الجھنوں کو موضوع بنایا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ عصمت نے مشرقی معاشرے کی عکاسی کی ہے لیکن یہ عکاسی محض خارجی عوامل کی پیش کش تک محدود نہیں بل کہ فرد کے داخلی محسوسات اور خیالات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ عصمت نے شمن کے کردار کے ذریعے ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے جو معاشرتی رویوں سے تھک کر بغاوت پر اتر آتی ہے۔اسے معاشرے کے اصول و قوانین نے ہی بغاوت پر اکسایا ہے۔ عصمت نے شمن کی صورت میں ایک مضبوط ہندوستانی عورت کا تصور دیا ہے جو بلاوجہ کے سماجی دباؤ برداشت کرنے کے بعد جب اپنی طاقت کا اظہار کرتی ہے تو پدر سری نظام کی تردید کرتی ہے۔ عصمت نے شمن کے کردار کو معاشرتی دباؤ، اخلاقی پستی اور جنسی شعور کی ناپختگی کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور ان تمام عوامل کا اس کی نفسیات پر اثر دکھایا گیا ہے۔جن پر اس سے پہلے معاشرتی پابندیوں کی وجہ سے کسی نے قلم اٹھانے کی جرات نہ کی تھی۔ عصمت نے قدیم ناول نگاری کے فنی ڈھانچے سے انحراف کی راہ اپناتے ہوئے فن، تکنیک اور فکری حوالے سے ایک نیا پن پیدا کیا۔

ذیل کی سطور میں ناول کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس سے ناول میں موجود مخفی مفاہیم و معانی اخذ کرنے اور عصمت چغتائی کے نظریات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے گا۔

ا۔ نفسیاتی کشمکش:

ٹیڑھی لکیر میں عصمت چغتائی نے کرداروں کے نفسیاتی تجزیے پیش کیے ہیں۔ ناول میں کردار کے حالات وواقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی نفسیاتی الجھنوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "نفسیات ایسا علم ہے جو فرد کے کردار کا سائنسی مطالعہ اس کے ماحول میں کرے" (۴)۔ ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے کرداروں کے عمل اور رد عمل کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار شمن ہے، عصمت نے شمن کی نفسیاتی الجھنوں کا ذکر کرنے سے پہلے ان تمام تر سماجی پریشانیوں اور الجھنوں کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجے میں وہ نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔ ناول میں کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کے دوران عصمت کسی بھی ماہر نفسیات کے اصولوں کی مکمل طور پر تابع نظر نہیں آتی بل کہ انھوں نے ان اصولوں سے خیالات مستعار لے کر اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ عصمت نے فرائڈ کے "تحلیل نفسی" کے اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ شبنم رضوی کے مطابق:

> ٹیڑھی لکیر کے سلسلے میں عصمت چغتائی نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے ٹیڑھی لکیر میں فرائڈ کے بد نام زمانہ اصولوں سے انحراف کر کے فرد کے ماحولیاتی اثرات پر زیادہ زور دیا ہے۔ (۵)

لیکن ناول میں فرائڈ کے فلسفے سے مکمل انحراف نہیں ملتا بل کہ بعض کرداروں میں عصمت فرائڈ کے فلسفے کی تابع نظر آتی ہیں جیسے عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول میں پروفیسر عبدالسلام یوں رقم طراز ہیں:

> "نوری کج روی سے اس لیے بچ جاتی ہے کہ فرائیڈ کے الفاظ میں اس کی Id پر Super Ego کی حکمرانی قائم رکھی جاتی ہے اس کے بر خلاف شمن کا عمل بیشتر اس کی Id کے تابع ہو جاتا ہے۔ جہاں عقل، منطق، اخلاق کسی کا حکم نہیں چلتا اس کی حرکات impulsive ہوتی ہیں۔ اسی فرق کی بنا پر نوری بیاہ رچا کر اپنے دولہا کی دنیا میں مگن ہو جاتی ہے اور شمن ناآسودہ روح کے ساتھ بھٹکتی رہتی ہے۔ (۶)

اسی طرح شمن کا رائے صاحب سے محبت کا اظہار کرنا نفسیاتی اصطلاح میں Oedipus complex کہلاتا ہے جس میں ایک لڑکی کا اپنے باپ کے لیے حد سے بڑھا ہوا جذبہ محبت کار فرما ہوتا ہے، یہ نظریہ فرائڈ کے ہاں بھی ملتا ہے۔ دوسری طرف ناول میں ایلما کا کردار پیش کیا گیا ہے جس میں ایلما کا اپنے باپ سے بے انتہا محبت کا جذبہ کار فرما ہے جو نفسیاتی اصطلاح میں Electra complex کہلاتا ہے یہ نظریہ بھی فرائڈ سے ماخوذ ہے۔ یوں تو مکمل طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عصمت نے فرائڈ کے نظریات سے انحراف کی راہ اپنائی ہے۔

فرد کی زندگی پر ماحولیاتی عناصر کے اثرات کے حوالے سے دیکھا جائے تو عصمت نے ٹیڑھی لکیر میں Naturalism کے فلسفے کی حمایت کی۔ جس میں کرداروں کی ذہنی صلاحیتوں، الجھنوں، مسائل اور

حالات وواقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے رد عمل کا جائزہ لیا ہے۔اس حوالے سے عصمت کے خیالات کو قمر رئیس نے یوں پیش کیا ہے:

"فرائڈ کہتا ہے کہ ہمارا ہر فعل جنسی تحریک سے ہوتا ہے مگر میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جنس اپنی جگہ ہے مگر ماحول کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے"۔(۷)

آلفرڈ ایڈلر نے "انفرادی نفسیات" کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے ہیں جن میں فرد کی انفرادی زندگی کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے اور حالات وواقعات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شخصی رد عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔آلفرڈ کے مطابق کردار میں معاشرتی دباؤاور رکاوٹوں کی وجہ سے احساس کم تری پیدا ہو جاتا ہے جس کے اثرات اس کے رویے پر پڑتے ہیں۔عصمت چغتائی نے آلفرڈ کے نظریات کی عکاسی اپنے ناول میں بھی کی ہے جس کی سب سے بڑی مثال شمن ہے۔شمن ناول کا مرکزی کردار ہے جو پیدائش کے بعد ہی والدین کی محبت سے محروم کر دی گئی تھی یوں اس کی شخصیت کی مناسب نشو نما نہ ہو پائی اور اس کی انفرادی زندگی پر برے اثرات مرتب ہوئے، شمن ابتدا ہی سے عدم توجہی اور ذہنی الجھاؤ کا شکار ہو گئی بعد ازاں معاشرتی پابندیوں نے اس کا حلقہ اور بھی تنگ کر دیا۔جس نے اس میں باغیانہ رویوں کو تحریک دی۔خلیل الرحمٰن اعظمی کے مطابق:

"ہندوستانی معاشرت میں اخلاقی پابندیوں اور جنسی شعور کے مناسب نشو نما نہ پانے کی وجہ سے متوسط طبقے کی ایک ذہین اور ہونہار لڑکی جس طرح نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتی ہے اس کا اثر زندگی کے تمام شعبوں میں جس نوعیت سے پڑتا ہے اس کی جتنی کامیاب عکاسی عصمت نے کی ہے اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے"(۸)

اسی طرح عصمت چغتائی نے رولف اور کدن کے کردار پیش کیے ہیں جو آلفرڈ کے پیش کردہ نظریات کے مطابق انفرادی طور پر احساس محرومی کا شکار ہیں۔رولف ایلما کی ناجائز اولاد ہے جسے اسے ناچاہتے ہوئے بھی اپنانا پڑتا ہے اور اس کے باپ کا بدلہ وہ اسے تشدد کا نشانہ بنا کر اتارتی ہے۔ماں کے ناروا رویے کی وجہ سے رولف میں ایک عجیب طرح کا رویہ پروان چڑھتا ہے، وہ ہر وقت دوسروں کو ٹھیس پہنچا کر توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے۔اس کی مثال ان الفاظ میں ملتی ہے:

"بچہ نہایت چلبلا تھا۔اس کی بوڑھی آیا قابو میں کرنے کے لیے برابر اس سے کشتی لڑ رہی تھی۔بار بار اس کی ممی سے ڈرا رہی تھی جو نہ جانے کس کام کو گئی ہوئی تھی۔مگر بچے میں بلا کی پرواز تھی۔بیٹھے بیٹھے اچھل کر لوٹ لگاتا اور پاس رکھی ہوئی ہر چیز کو جھنجوڑ ڈالتا۔

"بری بات بابا"آیا کہتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا۔ مگر پھر اس کے جسم میں روانی کی لہریں اٹھتیں۔ پہلے ٹانگوں کو بستر سے ٹکراتا پھر ہتھیلیاں تسموں سے جھولنے لگتیں سر کوک بھرے کھلونے کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں مٹکنے لگتا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ننھا سا جیتا جاگتا بھونچال بن جاتا"(۹)

دوسری طرف کدن اپنی دادی کے بے جا لاڈ پیار سے اپنی صلاحیتوں سے بالکل بے گانہ ہو جاتا ہے اور ہر وقت دادی کے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ کمزور قوت فیصلہ کی بنا پر وہ دادی کی مرضی کے بنا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا اور وہ اپنے ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے دادی کی مرضی کا محتاج تھا۔ اس کی مثال ناول میں یوں ملتی ہے:

"کدن دادی کے ساتھ چولہے کے پاس بھی گھستا۔ یہاں تک کہ وہ رفع حاجت کو جاتی تو باہر کھڑا جلدی نکلنے کے تقاضے کرتا رہتا۔ شمن سے تو وہ پہلے ہی دن ڈر گیا تھا۔۔۔"(۱۰)

اسی طرح عصمت چغتائی نے یہاں ایک اور تصور بھی دیا ہے کہ عموماً خاندان میں ہم عمر بچوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا جا رہا ہوتا ہے یہ موازنہ ایک خاص حد تک تو ٹھیک رہتا ہے لیکن ہر وقت کا بے جا موازنہ بچے کے ذہن پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ جس کا موازنہ کیا جا رہا ہوتا ہے، اور جس سے موازنہ کیا جا رہا ہوتا ہے دونوں کی نفسیات پر برا اثر پڑتا ہے۔ ایک بچہ احساس برتری اور دوسرا احساس کم تری کا شکار ہو سکتا ہے۔ گھر والوں کی عدم توجہی کی بنا پر شمن کی حالت درست نہ ہوتی تھی اور بڑی آپا ہر وقت نوری کو شمن کی مثالیں دیا کرتی تھی اور ڈرایا کرتی تھی کہ اگر کوئی بات نہ مانو تو شمن جیسی ہو جاؤ گی۔ ایسا موازنہ بچوں کو پریشان کر دیتا ہے اور ان کی نفسیات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ ناول میں شمن کے رد عمل کو عصمت چغتائی نے یوں پیش کیا ہے:

"شمن نے دیکھا نوری منجھو کے دولہا کی گود میں بیٹھی مینا کی طرح چہک رہی ہے اس کا جی سلگ اٹھا۔ بس چلتا تو وہ نوری کی بوٹی بوٹی کر کے پھینک دیتی۔ کمینی کہیں کی۔ ہر بات میں ماں بیٹیاں ذلیل کرنے آن مرتی ہیں۔ نوری گوری ہے وہ کالی، نوری نازک ہے وہ بھدی، نوری ہنس مکھ شرمیلی، باتمیز اور پڑھنے میں تیز، وہ بد مزاج بد تمیز اور پھوہڑ۔ پڑھنے سے دم چراتی۔ نوری روز کا سبق قرآن شریف کا جھٹ پٹ یاد کر، سنا دیتی شمن پر اس بات پر ہزاروں پھٹکاریں پڑتیں۔ وہ اپنا پچھلا سبق بھی بھول جاتی۔۔۔"(۱۱)

شمن کے احساس کمتری کی ایک مثال یوں بھی ملتی ہے:

"وہ شمن سے اپنے آپ کو کچھ برتر خیال کرنے لگی تھی۔ اس کا مول اتنی جلدی ہو گیا، اور جس طرح دکان میں رکھی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا مول تول غیر متوقعہ قیمت پر ہو جائے۔ کوئی گانٹھ کا پورا آن پہنچے۔ تو باقی کا مال حقیر پڑا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح شمن بھی کچھ متحیر اور حقیر سی رہ گئی۔ اسے ایک ہلکا سا احساس کمتری بھی ہونے

لگا۔ آخر وہ کیوں زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ جاتی ہے؟ بیماری سے اٹھی ہوئی دم پچی مرغی کی طرح وہ بدہیئت اور حقیر، نوری کی رومانی کمسنی کے آگے ایک متعفن پھوڑا معلوم ہوئی۔(۱۲)

عصمت چغتائی نے ناول میں کرداروں کی نفسیات کی بہترین عکاسی کی ہے ناول میں ہر عمر کے کردار ملتے ہیں۔انھوں نے جس طرح بچوں کی نفسیات کی عکاسی کی ہے ویسے ہی وہ بوڑھی عورتوں کی نفسیات کی عکاسی کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ عصمت نے نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بڑی بوڑھیوں کے روا رکھے جانے والے برتاؤ کی وجہ ان کی عمر کے ڈھلنے اور اس کے ان کی نفسیات پر اثر کو قرار دیا ہے اور اس کی پیشکش یوں کی ہے:

"۔۔۔آج اسے معلوم ہوا کہ بجائے غصہ کے ان بوڑھیوں پر رحم آنا چاہیے۔ جوانی کہیں ڈانٹ پھٹکار سے دبتی ہے؟ ہار تو ہمیشہ بڑھاپے کی ہے۔ جب قدرت کسی کو خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے مسلنا شروع کر دیتی ہے تو وہ دانت کچکچا کر بہار ہی پر جلن اتارتا ہے۔ مسرت بھرے قہقہے ٹھی ٹھی، عشق بد معاشی، اور جوانی بے حیائی نظر آنے لگتی ہے"(۱۳)

انسان کی نفسیات پر اس کے گرد و نواح کا ماحول بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے انسان یا تو اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے یا پھر اس کے خلاف رد عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ شمن کا کردار اس کی سب سے اہم مثال ہے جو ماحولیاتی جبر سے تنگ آ کر مذہب و معاشرے کی تمام قیود سے آزاد ہو جانا چاہتی ہے۔ شمن ایک باغی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے جو ایک طرف عیسائیت سے مرعوب ہو کر یسوع مسیح کی بھیڑ بن جانا چاہتی ہے تو دوسری طرف ہم جنسیت کا شکار ہو جاتی ہے، اس دور کے ہندوستانی معاشرے کی ایسی واضح تصویر کشی عصمت چغتائی سے پہلے کسی کے ہاں نہیں کی گئی تھی۔ شمن کے بچپن کی نفسیاتی کیفیات کا ذکر عصمت چغتائی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"لوگوں کو شادی بیاہ کا ارمان ہوتا ہے مگر شمن کو کچھ دن سے کسی کو مارنے کا ارمان ہو گیا تھا۔۔۔۔ایک دن اسے بیٹھے بیٹھے اپنی گڑیا کو مارنے کا دورہ پڑا۔ پہلے تو اس نے اس کے ہولے ہولے دو ننھے طمانچے مارے پھر ایک دم اس پر بھوت سوار ہو گیا دھڑا دھڑ اس نے گھونسوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دانتوں اور ناخنوں سے اس کے پرزے کر دیے۔ گویا وہ اپنے کسی خوفناک دشمن سے لڑی ہو"(۱۴)

نفسیاتی الجھنوں کے زمرے میں عصمت نے اعجاز کا کردار بھی پیش کیا ہے جو احساس محرومی کا شکار ہو گیا تھا جسے (Inferiority Complex) بھی کہا جاتا ہے۔ بچپن میں والد کے انتقال کے بعد ماں کی دوسری شادی کے نتیجے میں اعجاز کے سوتیلے والد کی بدسلوکی کی وجہ سے اسے شمن کے گھر رہنا پڑا اور یوں وہ شدید احساس محرومی کا شکار ہو گیا۔ یہ احساس محرومی اس حد تک بڑھ گیا کہ اس کے لیے کسی سے بات تک کرنا مشکل ہو گیا۔ اعجاز کی اس کیفیت کا بیان عصمت نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"وہ عموماً چپ چاپ الو کی طرح بیٹھا بولنے والوں کے ہونٹ تکا کرتا۔شرارت تو وہ کرنا ہی نہ جانتا تھا۔۔۔۔وہ بالکل مار کھائے ہوئے بندر کی طرح ایک جگہ بندھا چاروں طرف آنکھیں دوڑایا کرتا،اس کی آنکھیں ایک ہی وقت میں بھوکی،ندیدی اور متحیر نظر آتی بغیر مانگے بھی،اس کی ہر ہلکی سی جنبش سے التجا اور بھکاری پن ٹپکتا تھا۔کھانے پر سب سے پہلے بغیر پکارے پہنچ کر دستر خوان کی سلوٹیں دور کرنے لگتا"(۱۵)

عصمت چغتائی نے اعجاز کے رویے کی وجہ اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو قرار دیا ہے،وہ چوں کہ گھر والوں کی توجہ سے محروم تھا،اس لیے توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ عجیب و حرکتیں کیا کرتا تھا۔

نفسیاتی حوالے سے ایک اور اہم کردار شمن کی بڑی آپا کا ہے۔یہاں عصمت نے معاشرتی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے بیوہ کی معاشرتی حیثیت کا جائزہ لیا اور بیوہ کی دوسری شادی نہ کرنے پر اسے در پیش مسائل کی پیشکش کی ہے۔بیوگی میں بڑی آپا نے اپنی ماں کے گھر رہنا شروع کر دیا۔چوں کہ اس وقت کے ہندوستانی معاشرے میں بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہ تھی اور دو بچوں کے ساتھ زندگی کا سفر کاٹنا مشکل ہو گیا تھا،اس وجہ سے آپا کے دل میں کسی ہم سفر کی خواہش نے سر اٹھایا لیکن معاشرتی اصولوں کے آگے ان کا بس نہ چل سکا۔ناول میں بڑی آپا کی نفسیاتی کشمکش کا اظہار اس طرح سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے دیور کی موجودگی میں خود کو تندرست ظاہر کرتی ہیں اور اس کی غیر موجودگی میں ان کی ساری توانائی ختم ہو جاتی ہے۔یہاں عصمت نے معاشرے کے اصولوں پر طنز کیا ہے،دوسری شادی کی اجازت مذہب نے بھی دے رکھی ہے لیکن معاشرتی رویوں کی وجہ سے انسان بے بس ہو جاتا ہے۔عصمت نے یہاں انسانی سرشت کے حوالے سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ اگر انسان کسی چیز کے بارے میں کچھ ٹھان لے تو کوئی رکاوٹ اس کا راستہ روک نہیں سکتی۔اس کی مثال انھوں نے بڑی آپا کے محلے کی ایک عمر رسیدہ عورت کے ساتھ غیر اخلاقی تعلقات کی صورت میں دی ہے۔

عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر میں اس دور کے معاشرتی رویوں کی حقیقی ترجمانی کی ہے لیکن یہاں انھوں نے اپنے ناول کے نسائی کرداروں کو رسوم رواج کے تابع نہیں دکھایا،بل کہ ان کے کردار معاشرتی جکڑ بندیوں کو توڑتے ہوئے اپنی الگ روش پر چل نکلتے ہیں اور تمام فرسودہ روایات سے منحرف ہو جاتے ہیں۔اسی لیے عصمت کے نسائی کردار اپنے دور کے نسائی کرداروں میں منفرد نظر آتے ہیں۔

۲۔ جنسی بے راہ روی:

ٹیڑھی لکیر کا ایک اور اہم موضوع جنسی بے راہ روی ہے۔عصمت نے ناول میں یونگ کے نظریہ "ہم جنسیت" کی پیشکش ہندوستانی سماج کے تناظر میں کی ہے۔ناول میں عصمت نے اس نظریے کو کمال مہارت سے پیش

کیا ہے۔ عصمت نے ہندوستانی معاشرتی دباؤ اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل کی عکاسی عمدگی سے کی ہے۔ ناول میں ایسے کردار بکثرت ملتے ہیں جو جنسی بے راہ روی کا شکار ہیں اس کی ایک مثال شمن ہے۔ شمن کی پیدائش کے بعد ماں باپ کی عدم توجہی اور ان کے افعال و کردار (یعنی افزائش نسل پر معمور ہونا) کے گہرے اثرات شمن کے ذہن پر مرتب ہوئے اس کے بعد جب اسے انا کے حوالے کیا گیا تو انا اور اس کے عاشق کے تعلقات اس کے ذہن پر منفی تاثر چھوڑتے ہیں اس حوالے سے پروفیسر عبدالسلام یوں رقم طراز ہیں:

> "ماں باپ کی تربیت اور محبت اسے حاصل نہیں ہو پاتی لہٰذا جذبہ محبت کی عدم تسکین جہاں اس میں احساس کمتری پیدا کرتی ہے وہاں اسے self-centered بھی بناتی ہے انا کا گداز جسم اس میں نفسیاتی لذت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ انا اور اس کے عاشق کی حرکت اس کے تحت الشعور میں جنسی جذبہ پیدا کرتی ہے(۱۶)

شمن کے کردار کے حوالے سے بات کی جائے تو شمن کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہو رہی ہے جہاں اسے ماں باپ کی توجہ حاصل نہیں ہے۔ انا اور بہنوں کی زیر نگرانی اس کی وہ نشو نما نہ ہو سکی جو ایک صحت مند ذہن کی تربیت کر سکے۔ بڑی آپا کی بلاوجہ کی تنقید اور کوسنوں نے اس کے اندر باغیانہ سوچ کو ابھارا۔ ان تمام مسائل کا سامنا کرتے ہوئے جب اس کا داخلہ بورڈنگ سکول میں کروا دیا گیا تو وہاں کے ماحول نے اس کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ بورڈنگ میں ہم جنسیت جیسے معاملات کو عصمت نے خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ جس سے ایک طرف تو تعلیمی اداروں میں کم عمر لڑکیوں کے جنسی جیسے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے تو دوسری طرف بے جا معاشرتی دباؤ اور گھٹن کو اس عمل کے ارتکاب کی وجہ قرار دیا جاتا ہے۔ عصمت نے جنسی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے معاشرے کے بظاہر معزز نظر آنے والے افراد کے اصل چہرے بے نقاب کرتے ہوئے ان کے شخصی رویوں کا بیان غیر جانبداری سے کیا ہے اس حوالے سے مسجد کے ملا کا واقعہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

> "پرانی مسجد کے ملاجی جن کے آتے ہی دونوں کھڑکی کے نیچے دبک جاتیں، دل دھڑکنے لگتے اور ناکوں پسینے آجاتے مگر پھر ان کے دلوں میں کھد بد ہوتی، رہ رہ کر جھانکنے کو جی چاہتا۔ وہ ڈری ہوئی چوہیوں کی طرح آہستہ سے اوپر ابھرتیں۔ ملاجی دیوار سے ناک لگائے گھٹنوں کھڑے عجیب بھیانک حرکتیں کیا کرتے۔ پہلے دن جب وہ بالکل بے خبر غور سے دیکھ رہی تھیں تو ان سے نہ جانے کیا کہنے لگے، پہلے تو ان کو سنائی نہ دیا کہ وہ کیا اشد ضروری بات کہنا چاہتے ہیں۔ مگر جب وہ ذرا آگے جھکیں تو مارے خوف کے وہ وہیں جم کر رہ گئیں جیسے اژدہے کو دیکھ کر بندر مسحور ہو جاتے ہیں۔۔۔"(۱۷)

یہاں محض معاشرے کے ایک فرد کے عمل کو زیر بحث لا کر معاشرتی خرابیوں کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اس ساری صورتحال کو واضح کیا گیا ہے جس میں مسجد کے ملا جیسے کردار پروان چڑھتے ہیں۔ خاص طور پر مسجد کے ملا کا ذکر کر

کے ان کے فرائض کی طرف سے ان کی کوتاہیوں کا ذکر کیا جارہا ہے کہ ایسے ماحول میں مذہب کے امیں بھی غیر اخلاقی افعال و سرگرمیوں کے مرتکب ٹھہرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی برتتے ہیں، اسی طرح عصمت نے جہاں لڑکیوں کی جنسی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے وہاں خاص طور پر اسلامی سکولوں کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں۔ جس سے ان کا مقصود بے جا مذہبی پابندیوں پر تنقید کرنا بھی تھا، اس سے یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ اسلام میں کہیں بھی جبر نہیں ہے بل کہ اسلامی قوانین انسان کو سہولت اور آسانی فراہم کرتے ہیں۔ اور اس کے فطری تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے ایک مکمل زندگی گزارنے کا حق دیتے ہیں۔ اسلام ایک لچک دار مذہب ہے یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسان کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا بل کہ اس کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے تاکہ وہ راہ راست سے بھٹکنے نہ پائے لیکن معاشرتی رویوں اور بے جا اقدار نے اس حوالے سے بھی خرابی کا سامان پیدا کیا ہے۔ مذہبی تعلیمات کی غلط تشریح نے ان معاشرتی قدغنوں کو جنم دیا ہے جو غیر اخلاقی رویوں کی وجہ بن رہے ہیں۔

شمن کے حوالے سے دیکھا جائے تو شمن بچپن ہی سے عدم توجہی کا شکار تھی، سکول میں داخلے کے بعد بھی وہ اپنی ہم جماعتوں، استانیوں اور پڑھائی سے ہم آہنگی نہ قائم کر پائی، جس کی وجہ سے اسے یہاں بھی سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور وہ مزید احساس کم تری کا شکار ہو گئی لیکن اس نے اسے کبھی اپنی حالت کو بہتر بنانے کا خیال نہ آیا۔ اسی دوران سکول میں مس چرن سے اس کا واسطہ پڑا۔ شمن کے ساتھ مس چرن کے محبت بھرے رویے نے اسے موم کر دیا۔ اور وہ مس چرن کا دیا گیا سارا کام ایمان داری سے کرتی۔ اس کے علاوہ وہ سکول کے دوسرے کام بھی شوق اور توجہ سے کرنے لگی۔ یوں اس کے حالات بہتر ہونے لگے۔ لیکن شمن کے ذہن پر مس چرن کی شفقت کا اس حد تک غیر معمولی اثر ہوا کہ اس نے راتوں کو بھی مس چرن کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور اکثر تو وہ رات میں بھی ان کے کمرے کے گرد چکر لگانے لگی، اس حوالے سے عصمت چغتائی یوں لکھتی ہیں:

> "راتوں کو وہ اب بھی برآمدوں میں سسکیاں بھرتی بھٹکا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جو رات کو اس کی آنکھ کھلی تو ہکا بکا رہ گئی۔ پرنسپل ٹارچ لیے مس چرن کے کمرے میں لمبا سا چوغہ پہنے کھڑی تھی۔ اور مس چرن پریشان شمن کو بٹھانے کو کوشش کر رہی تھی، اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو رہی ہے۔ پھر ایک دم وہ چپ ہو گئی اور منہ پھاڑے مس چرن کو تکتی رہی وہ مس چرن کے پلنگ پر بیٹھی تھی! سچ مچ کا پلنگ!! وہ خواب والا واہمہ نہیں بل کہ سبز پھول کڑھا ہوا تکیہ، بھورا کمبل جس میں کشمشی گوٹ لگی تھی۔۔۔" (۱۸)

مس چرن کی طرح ایک اور کردار منجھو کا ہے جس نے شمن کو بہت متاثر کیا اور شمن نے جس سے محبت کا لمس محسوس کرنا چاہا۔ شمن کے بچپن کے ابتدائی دور میں جب اس کا خیال رکھنے والا کوئی بھی نا تھا تو اس نے اس کا خیال رکھا دراصل یہ کردار شمن کے جذباتی بحران کو کم کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمن کو الفاظ سے زیادہ منجھو

کے قرب کی ضرورت محسوس ہوتی اور وہ اکثر اس کے لمس میں سکون محسوس کیا کرتی تھی۔ شمن کی اس کیفیت کا بیان ٹیڑھی لکیر میں یوں کیا گیا ہے:

"جب منجھو نے اسے پہلو میں لٹا کر رضائی اوڑھ لی تو وہ خلاف معمول خاموش اسے گھورنے لگی۔

"کیا ہے؟ منجھو نے پیار سے پوچھا اور وہ حسرت سے مسکرا اٹھی۔ آہستہ سے اس نے اس کی گردن پر اپنی انگلیوں سے کھجانا شروع کر دیا اور آنکھیں گڑ دیئے اس کے تل کو دیکھتی رہی جو بائیں گال پر چمک رہا تھا۔

نہیں بری بات منجھو نے اس کا کھٹکتا ہوا ہاتھ اٹھا کر پہلو میں رکھ دیا۔ وہ بسورنے لگی اور ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ منجھو پسیج گئی، اس کا ہاتھ اٹھا کر گردن میں ڈال لیا اور کلیجے سے لگا کر سو گئی"(۱۹)

منجھو اور مس چرن کی طرف شمن کے جھکاؤ کی ایک وجہ پیدائش کے فوراً بعد ماں کی محبت سے محرومی بھی ہو سکتی ہے۔ منجھو اور مس چرن دونوں کردار عمر میں شمن سے بڑے ہیں اور ان دونوں سے اسے محبت، شفقت اور توجہ ملی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں میں وہ ماں کی مامتا ڈھونڈ رہی ہو اور ان کی قربت اور محبت بھرا لمس اس کی تشنگی کو دور کرتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جسمانی تقاضوں کو پوا کرنے کے لیے ہی ان دونوں کے قریب رہنا چاہتی ہو۔

رائے صاحب شمن کی ہم جماعت پر یما کے والد ہیں جو اسے بالکل پر یما کی طرح چاہتے تھے۔ شمن نے پر یما کے ساتھ اس کے گھر آنا جانا بھی شروع کر دیا جہاں اسے رائے صاحب کی توجہ حاصل ہوئی۔ منجھو اور مس چرن کی طرح شمن رائے صاحب کی محبت میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ جس کی ایک دلیل یہ دی جا سکتی ہے کہ وہ بچپن میں چوں کہ باپ کی شفقت، محبت اور توجہ حاصل نہ کر پائی اس لیے اپنی محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لیے باپ کی عمر کے شخص کی طرف متوجہ ہو گئی، یا یوں کہیں کہ اس شخصیت نے اسے اتنا مرعوب کیا کہ وہ محبت کا دعویٰ کر بیٹھی۔ جسے نفسیات کی اصطلاح میں Electra Complex کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال ٹیڑھی لکیر میں یوں ملتی ہے:

"میں آپ سے پریم کرتی ہوں۔ اس نے سوکھے ہوئے گلے سے آخر کہہ ہی دیا۔

"ہیں؟" وہ اس کی طرف اجنبیوں کی طرح دیکھنے لگے۔"

"میں آپ سے۔۔۔ پریم۔۔۔ رائے صاحب! میں"، اس کی آواز اور گھٹ کر سہم گئی۔"

"ایں۔ شمن۔۔۔ اچھا سو جاؤ۔" وہ جلدی سے اس کی لپٹتی ہوئی انگلیاں الگ کرنے لگے۔

"نہیں۔۔۔ نہیں رائے صاحب میں مر جاؤں گی۔ رائے صاحب مجھے دور نہ کیجیے۔۔۔

میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی، اس نے اور قریب ہو کر کہا۔۔۔"(۲۰)

شمن کے بچپن کے حالات وواقعات کو مد نظر رکھا جائے تو اسے ماں باپ کی محبت نصیب نہ ہو سکی تھی اس حوالے سے اس کا باپ کی عمر کے شخص کی طرف متوجہ ہو کر اظہار محبت کر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن اگر اس کے معاشرتی پس منظر پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ ایک لڑکی اظہار محبت کرے اور پھر اس محبت کو پانے کی خاطر تبدیلی مذہب کا دعویٰ بھی کرے۔ اس سے عصمت کے نسائی کرداروں کے ارتقا کا پتا چلتا ہے کہ وہ معاشرتی جکڑبندیوں سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔

ٹیڑھی لکیر میں لڑکیوں کی ہم جنسیت کو بھی واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ عصمت نے سکولوں اور بورڈنگ میں موجود کم عمر لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی بہت باریک بینی سے کی ہے۔ انھوں نے ہاسٹل میں موجود لڑکیوں کے رجحانات اور ان کے خیالات کی واضح تصویر کشی کی ہے۔ اس حوالے سے رسول فاطمہ، نجمہ اور سعادت کے کردار پیش کیے ہیں جو ہم جنسیت جیسی غیر اخلاقی بیماری میں مبتلا ہیں اور اپنی اقدار سے انحراف کی راہ اپنائے ہوئے ہیں۔ رسول فاطمہ شمن کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتی ہے جو اس پر بے انتہا فریفتہ ہے اور شمن کی قربت کی خواہاں ہے۔ رسول فاطمہ کی انتہا کی بڑھی ہوئی خواہشات کو عصمت نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

> "ایک دفعہ رات کو شمن کو اپنی گردن پر چوہا پھدکتا معلوم ہوا، اندھیرے میں وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ چوہا رسول فاطمہ کے پلنگ پر بھاگ گیا۔۔۔ وہ پھر لیٹ گئی۔ نیم غنودگی کی حالت میں اسے پھر چوہا پٹی پر رینگتا معلوم ہوا۔ دھندلکے میں بڑے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چوہا نہیں بل کہ سوتے میں رسول فاطمہ کا ہاتھ ہل رہا تھا۔۔۔ رسول فاطمہ کی سوکھی ہوئی انگلیاں کیلوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ مگر وہ اسے روک نہ سکی۔" (۲۱)

اس کی ایک اور مثال رسول فاطمہ کی طرف سے ملنے والے ایک خط میں یوں ملتی ہے:

> "میرے من مندر کی دیوی:
>
> آہ، اپنی عاشق سے کیوں ناراض ہو، کب تک خفا رہو گی۔ اگر ایسی ہی مجھ سے نفرت ہے تو اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو۔۔۔ یہ تم نے کیا جادو کر دیا ہے۔۔۔ ایک دفعہ اپنے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگ لینے دو۔
>
> تمھارے حسن کی پروانہ رسول فاطمہ "۔ (۲۲)

عصمت چغتائی نے رسول فاطمہ کی طرف سے انتہا کو بڑھتے ہوئے جذبے کی عکاسی کی ہے، شمن کے برتاؤ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سارے معاملے سے بری الذمہ ہے لیکن رسول فاطمہ کے عمل پر اسے نہ روکنا اور اس کی جانب سے خط پا کر اسے پڑھنے کے لیے بے چین ہونا کہیں نہ کہیں اس کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ بظاہر شمن رسول

فاطمہ سے نالاں ہے اور بیماری کا بہانہ بنا کر ہسپتال میں رہنا شروع کر دیتی ہے لیکن کہیں نہ کہیں اس کے اندر بھی یہ خواہش موجود ہے۔اس سے عصمت نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ شمن معاشرتی جکڑبندیوں میں الجھی ہوئی ہے اسی وجہ سے خواہشات کی تکمیل کا حوصلہ نہیں رکھتی۔دوسری طرف شمن کا نجمہ اور سعادت کی قربت کو ناپسند کرنا اور نجمہ کی خوشبو تک کو محسوس کر کے محظوظ ہونا اس بات کی تائید کرتا ہے کہ وہ خود بھی ہم جنسیت کے مرض کا شکار ہو چکی ہے۔شمن کی جنسی سرگرمیوں کو عزیز احمد جنسی بیماریوں کا نام دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"عصمت کی ہیروئن پہلی منزل یعنی عنفوان شباب کے زمانے تک پہنچنے سے قبل ہی پانچ غیر معمولی جنسی بیماریوں سادیت،ماسوفیت،گوئیاں پرستی،بوپرستی اوشے اور عضو کی پوجا میں گرفتار ہوتی ہے۔کرافٹ بیگنگ کی Psycopathia Sexulis میں جتنے غیر معمولی امراض ہیں،جن میں سے کوئی ایک بھی اس کے لیے کافی ہے کہ کسی مرد یا عورت کو عام صحت مند راستے سے عمر بھر کے لیے ہٹا دے وہ سب کے سب اس ناول کے پہلے حصے میں مصنف نے اقلیدس کے مسئلوں کی طرح جمع کر دیے ہیں"(۲۳)

ناول میں دوسرا مرحلہ سکول کے بعد کا آتا ہے جہاں شمن کو یہ باور کروایا جاتا ہے کہ لڑکیوں کو لڑکوں سے عشق کرنا چاہیے جنھیں عصمت نے "کوڑیالوں" کا نام دیا ہے۔لڑکیوں سے لڑکوں کی طرف متوجہ ہونا شمن کی زندگی کا ایک نیا موڑ تھا "عصمت نے اسے دوسری منزل کا عنوان دیا ہے دراصل یہ اس کی جنسی زندگی کی دوسری منزل ہے"(۲۴)

ناول میں اس دور کے تحت چند قصے پیش کیے گئے ہیں جن سے شمن کے جنسی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔اس حوالے سے ستیل اور افتخار کے کردار کا قابل ذکر ہیں ان دونوں شخصیات نے شمن کو متوجہ کیا لیکن ستیل کی کشش کچھ دیر ہی میں ماند پڑ گئی اور شمن کی تمام تر توجہ افتخار کی طرف مبذول ہو گئی۔یونیورسٹی کے بعد سکول کی ہیڈ مسٹریس بننے پر جب ایک خاتون نے خود کو افتخار کی بیوی بتایا اور اس کے دیگر کئی معاشقوں کا تذکرہ کیا تو شمن یہ برداشت نہ کر سکی اور اس نے ترقی پسند گروہ کے چند معززین کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا اور اپنی دانست میں افتخار سے بدلہ لینے کو ان کے ساتھ وقت گزاری بھی کی۔

ناول میں ایک اہم کردار ایلما کا بھی پیش کیا گیا ہے جو معاشرتی پابندیوں کی پروا کیے بنا اپنی من مانی کرتی ہے۔ایلما کا شمن کی کالج کی سہیلی ہے۔جو کالج کے ایک لڑکے افتخار پر فریفتہ ہے لیکن معاشرتی جکڑبندیوں سے آزاد ہے ،ایلما مذہب اور معاشرہ دونوں سے بغاوت اختیار کرتی ہے۔اور بنا شادی کیے ستیل کے بچے کی ماں بن جاتی ہے،لیکن یہاں اسے پریشانی اس بات کی نہیں ہوتی کہ ناجائز بچہ پیدا کرنے پر لوگ کیا کہیں گے بل کہ وہ ستیل سے سخت نفرت

کرتی ہے اور اس کے بچے کی ماں بننے کو تحقیر سمجھتی ہے۔اس حوالے سے شمن اور ایلما کی گفتگو کو عصمت نے یوں بیان کیا ہے:

"۔۔۔ہاں تم سوچ رہی ہو کہ ـــ میں نے پاپ کیا ہے۔ یہ بات نہیں میں اسے پاپ نہیں سمجھتی۔ مگر"۔۔۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں ـــ میں نے واقعی پاپ کیا ہے"

"ایلما۔!"

"میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔۔۔۔میں نے اپنی روح کو دھوکا دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا۔

"کیا بک رہی ہو ایلما۔ کیا مطلب؟"

ہیں؟ نہیں ،میں بہک گئی تھی۔۔۔وہ تھوڑی دیر کو چپ ہو گئی۔ پھر بولی۔ تم نہیں سمجھتیں۔۔۔تم بھول گئیں۔۔۔میں نے تم سے کہا تھا نا کہ۔۔۔"

ہاں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم افتخار کا۔۔۔۔۔

"ہاں ہاں۔۔۔۔یہی تو مصیبت ہے اگر ایسا ہوتا تو"۔ پھر کچھ سوچنے لگی"

"اگر ایسا ہوتا تو میں اس کی امانت اپنے سینے سے لگا کر رکھتی۔۔۔"وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اونچی آواز سے بکنے لگی۔

اس وقت جو شیطان میرے جسم میں سانس بھرنا سیکھ رہا ہے وہ ستیل کا تحفہ ہے۔اور میں نے اپنے جسم کی آرزو پوری کر دی مگر میری روح ابھی بھوکی ہے۔۔۔"(۲۵)

سماجی تناظر میں ایلما کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو اس نے مذہب اور سماج دونوں سے بغاوت کا راستہ اختیار کیا ہے۔ مذہبی حوالے سے دیکھا جائے تو نیکی اور بدی کا چکر اور سماجی حوالے سے بات کی جائے تو اچھی اور بری عورت کا تصور،اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک لڑکی بنا شادی کیے کسی کے بچے کی ماں بن جائے لیکن ایلما کو سماج کی کوئی پروا نہیں ہے وہ اس لیے خائف نہیں ہے کہ دنیا والے کیا کہیں گے،اسے اس بات کا غم ہے کہ اس نے اپنے جسم کی آرزو کو پورا کرتے ہوئے روح کو تشنہ رکھا ہے۔

ٹیڑھی لکیر میں عصمت چغتائی نے جنسی حوالے سے بچوں کی نفسیات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ناول میں ایسے کردار بھی پیش کیے گئے ہیں جو بچپن ہی سے غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ان میں ایک مثال شمن کے

خالہ زاد اعجاز کی ہے جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر شمن کے ایک لمس کے حصول کے لیے پانی پینے کی مشق کیا کرتا تھا۔اور شمن کے جوتے کو بھی سینے سے لگائے رکھنے کو باعث اطمینان سمجھتا تھا۔اس کی مثال ذیل کی سطور میں یوں ملتی ہے:

"رات کو سب بچوں کے پلنگ برابر ڈال دیے جاتے۔اجو کسی نہ کسی بہانے سے اپنا پلنگ شمن کے قریب اڑا لیتا۔کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے۔کیوں کہ لوگ اسے حد درجہ کا بیوقف جانتے تھے۔لیکن شمن کا ہی جی جانتا تھا۔جب سب سو جاتے تو اجو آہستہ آہستہ اس کے پیروں میں اپنے پیروں کا انگوٹھا اور انگلیاں ملا کر چٹکیاں لیا کرتا تھا۔۔۔"(۲۶)

اسی طرح ہاسٹل میں موجود چھوٹی بچیوں کی غیر اخلاقی سرگرمیوں کا تذکرہ عصمت نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"ابھی گزشتہ مہینے چھوٹی کلاس کی بچیوں کو بیہودہ کھیل کھیلنے پر سزا ملی تھی۔وہ لحافوں میں دبکی ہوئی ایک دوسرے کو بچے جنوا رہی تھیں!"(۲۷)

بورڈنگ میں رہنے والی لڑکیوں کے ساتھ بڑی لڑکیوں کے رویے کا بیان عصمت نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"یہ چھوٹی لڑکیاں بورڈنگ میں بڑی لڑکیوں کی لونڈیوں کی طرح ہوتی ہیں۔چھوٹے موٹے کام،رقعہ پیغام لے جانا،چمن میں سے پھول چرا کر لانا کتابیں لاد کر ادھر سے ادھر لے جانا اور اس کے بدلے میں کبھی کبھی بڑی لڑکیوں کے سر یا پیر دبانے کی عزت حاصل کرنا۔جتنی زیادہ ہر دلعزیز لڑکی ہوگی اتنی زیادہ چھوٹی لڑکیاں اس کی خدمت میں حاضر رہیں گی۔(۲۸)

معاشرتی مسائل پر عصمت کی نظر گہری تھی ،انھوں نے اپنے ناول میں اس کی بہترین عکاسی بھی کی ہے ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے ایسے بے شمار کردار پیش کیے ہیں جو جنسی بے راہ روی کا شکار ہیں اور جنسی مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔اسی حوالے سے ایک کردار شمن کی بڑی آپا کا ہے جنھیں بیوگی کے بعد سماجی رکاوٹوں کی وجہ سے شادی نہیں کرنے دی جاتی۔اس کے نتیجے میں وہ کبھی اپنے دیور کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو کبھی محلے کی عزیز بیگم سے تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

عصمت چغتائی نے معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے خواتین اور معاشرے کے دیگر افراد کی نفسیاتی کیفیات کی عکاسی بخوبی کی ہے۔انھوں نے جنسی حوالے سے جس طرح اپنے نسائی کرداروں کا تجزیہ پیش کیا ہے ان سے پہلے کسی کے ہاں نہیں ملتا۔ان کے نسائی کردار روایت سے انحراف کرتے ہوئے بغاوت کا راستہ اپناتے ہیں۔

۳۔ شخصیت کی تعمیر اور معاشرتی عوامل:

عصمت چغتائی نے ناول میں انسانی نفسیات کی عکاسی بہت خوب صورت انداز میں کی ہے اور اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے کہ فرد کی شخصیت کی تعمیر و تخریب میں معاشرے اور ماحول کا اثر بہت گہرا اور واضح ہوتا ہے۔اس کی مثال کے طور پر انھوں نے شمن کا کردار پیش کیا ہے، شمن والدین کی دسویں اولاد تھی اور ماں باپ بچوں کی گنتی بڑھانے پر معمور تھے، دونوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ بچوں کی تربیت کے لیے وقت نکال سکیں۔ شمن کے پیدا ہوتے ہی اسے انا کے حوالے کر دیا گیا جس سے والدین کی محبت اور شفقت سے وہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ انا سے انس پیدا ہوا تو وہ اس کی جنسی سرگرمیوں کی وجہ سے انتشار کا شکار ہو گئی اور جب انہی سرگرمیوں کی وجہ سے انا کو واپس بھجوادیا گیا تو شمن کی ذمہ داری منجھو کو دے دی گئی لیکن شمن انا کا غم غلط نہ کر پائی اور منجھو کو ستانا شروع کر دیا، منجھو نے شمن کو سنبھال تو لیا لیکن وہ اسے وہ پیار نہ دے پائی جو ایک ماں اپنی اولاد کو دے سکتی ہے اس حوالے سے صفیہ اختر یوں رقم طراز ہیں:

> "منجھو شمن کو شدت سے چاہتی ہے مگر وہ خود ماں تو نہیں ہے نہ اسے وہ بنیادی تجربے حاصل ہیں جو ایک عورت کے ماں بننے کی بنیادی تربیت کرتے ہیں۔ منجھو کی طبیعت میں وہ تحمل، وہ برداشت، احساسات میں وہ استواری نہیں جو ایک عورت کے ماں بن کر ہی آسکتی ہے"(۲۹)

ماہرین نفسیات کے مطابق بچے کی شخصیت کی تعمیر میں زندگی کے ابتدائی چند سال خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، جو اس کی آئندہ آنے والی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ ناول میں شمن کے بچپن سے لے کر شادی تک کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ جن میں اس کی شخصیت کی تمام تر کجیوں کی ذمہ داری اس کے گھریلو حالات پر ڈالی گئی ہے۔ بچپن ہی سے عصمت کے منفی رویے کی وجہ اس کا جذباتی بحران تھا۔ جو اس کی پوری زندگی پر اثرانداز ہوا۔ شمن کی پیدائش کے وقت گھر والوں کی کوفت کا بیان عصمت چغتائی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "خدا غارت کرے اس منی سی بہن کو۔ اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی۔"، حد ہو گئی تھی! بہن بھائی اور پھر بہن بھائی۔ بس معلوم ہوتا تھا، بھک منگوں نے گھر دیکھ لیا ہے، امڈے چلے آتے ہیں ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو اور پے در پے آرہے تھے۔ کتے بلیوں کی طرح، ازلی کتے مریھکے"(۳۰)

جس کی پیدائش کے وقت ہی ایسے معاملات ہوئے اس بچے کو گھر والوں کی توجہ کیسے مل سکتی ہے۔ عصمت نے شمن کے ساتھ گھر والوں کے رویے کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے منجھو اور بڑی آپا کے کردار پیش کیے ہیں۔ بڑی

آپا ہمیشہ سختی سے پیش آتیں اور اس کے مقابلے میں اپنی بیٹی سے لاڈ کیا کرتیں، شمن بڑی آپا کا کہا ٹالتی تو کبھی نہیں تھی لیکن اس کے نتیجے میں ایک رد عمل ہمیشہ اس کے دل میں اٹھا کرتا اس کی مثال یوں پیش کی گئی ہے:

"۔۔۔بڑی آپا کو بڑا فخر تھا کہ گھر بھر میں کسی کی نہیں سنتی مگر ان کی گھر کی سے شمن کانپ اٹھتی ہے اور فوراً کہنا مان لیتی ہے۔ مگر انھوں نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ یوں کہنا مانتے وقت شمن کی آنکھیں کسی خوفناک نفرت سے دہک اٹھتی ہیں، ایسے ہی جیسے پنجرے میں بند شیر سدھارنے والے کے چابک سے ڈرتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جو خونی نفرت نظر آتی ہے اسے کچھ سدھارنے والے کا جی ہی جانتا ہے" (۳۱)

بچپن ہی سے ہر شے پر منفی رد عمل اس کی شخصیت کا حصہ بن گیا جو تا عمر قائم رہا۔

۴۔　　تصور عورت:

عصمت چغتائی نے ہندوستانی معاشرے میں رہتے ہوئے ایک ایسی عورت کا تصور دیا ہے جو گھر کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں ہے بل کہ وہ اپنا ایک واضع نصب العین رکھتی ہے اور زندگی کے بسر ان کے لیے اس کا اپنا ایک لائحہ عمل ہے۔ عصمت نے سماجی رسوم ورواج سے انحراف کی راہ اپنائی ہے اور عورت کو اس خاص پدر سری معاشرتی تصور سے آزاد کرتے ہوئے ایک نیا تصور متعارف کروایا ہے۔ اس کی وضاحت ذیل کے اقتباس سے ہوتی ہے:

"عصمت کے نسوانی کرداروں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کے پس پشت بھی ایک ایسی "عورت" موجود ہے جو مجتمع کرنے کی بہ نسبت توڑنے اور بکھرانے میں زیادہ دل چسپی رکھتی ہے۔۔۔۔ دیو مالا میں اس کے کئی نمونے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ہندو دیو مالا کی "کالی" جس کا کام مدون اور مرتب کائنات کو لخت لخت کرنا ہے۔ یا سمیر کی تیامت جس کی موج ہستی ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتی ہے۔ عصمت کے موضوعات منفرد ہیں۔ سماجی حالات پر ان کا ایک الگ ہی رد عمل ہے۔ اس عمل سے گزرتے ہوئے وہ مروجہ عقائد، سماجی و ثقافتی اقدار، حتیٰ کہ مذہبی اصولوں تک کی دھجیاں ادھیڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں عورت کے جذبات، ذہنی کیفیات، روز مرہ کی وارداتوں پر ان کے نفسیاتی رد عمل اور ان کے مخصوص سماجی حالات کی عکس بندی فنکارانہ مہارت سے کی گئی ہے" (۳۲)

ٹیڑھی لکیر میں عصمت چغتائی نے ہندوستانی روایتی تصور عورت سے انحراف کی راہ اپناتے ہوئے شمن کا کردار پیش کیا جو اپنی زندگی اپنے وضع کردہ اصولوں کے تحت گزارنا چاہتی ہے۔ جس دور میں یہ ناول تصنیف کیا گیا اس سے پہلے حقوق و تعلیم نسواں کی تحریکیں اپنا اثر دکھا چکی تھیں اور خواتین کے لیے تعلیم کی راہیں ہموار کر دی گئیں تھیں۔ لیکن اس پر کوئی نہ کوئی پابندی ضرور عائد تھی، عصمت نے تمام روایات کو توڑتے ہوئے شمن کا کردار پیش کیا ہے۔

شمن نے اپنی پوری زندگی کو اپنے مطابق بسر کیا اس کی شخصیت کا ارتقا اس کی یونیورسٹی سے شروع ہوا۔ سکول تک اس کی ذات کا دائرہ کار محدود تھا لیکن کالج اور یونی ورسٹی کی فضا نے اسے ایک نیا رخ دیا اور یوں اس نے اپنے لیے نئے راستے منتخب کیے۔ اس دور کے مطابق دیکھا جائے تو لڑکی کا اپنی شادی کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن شمن نے اپنی پسند سے ایک آئرش نوجوان سے شادی کر لی جو مسلمان بھی نہ تھا۔ یہ شادی دونوں کی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ عرصہ نہ چل سکی لیکن اس کے باوجود شمن نے یہ جرات کی کہ وہ معاشرے کے تمام اصولوں کو توڑ ڈالے۔ عصمت کے تصور عورت کی وضاحت ان الفاظ سے ہوتی ہے:

"اس عورت ذات میں بڑے بڑے معجزے دکھانے کی طاقت پوشیدہ ہے۔ وہ چاہے تو دنیا سے یہ قوم اور نسل کا فتنہ مٹا سکتی ہے"(۳۳)

اسی رنگ و نسل کے تعصب کو مٹانے کے لیے شمن نے رونی ٹیلر سے شادی کی لیکن معاشرے کی طنز آمیز نگاہیں دونوں کے لیے اذیت کا باعث بن کر رہ گئیں۔

"حیف ہے کہ مرد عورت کو پیر کی جوتی، ناقص العقل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، مگر یہ جوتی جب ان کے سر پہ بجتی ہے تو احساس خودی بھی فنا ہو چکتا ہے۔ اسے سارے مرد مظلوم نظر آنے لگے اور ساری سونے روپے میں لدی ہوئی بیویاں ظالم، جو ان کی کمائی پر بالکل اسی طرح قابض تھیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقت پر۔ وہ اپنے جسم کی قیمت لیتی تھیں۔۔۔ بجائے درجنوں کے صرف ایک سے"۔(۳۴)

ہندوستانی طرز معاشرت کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر شمن کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اپنے طبقے کی دیگر خواتین سے یکسر مختلف تھی اس نے بے جا رسومات کی اندھا دھند تقلید نہیں کی بل کہ اپنی زندگی کو جدید اصولوں کے مطابق بسر کیا جو اس کے اپنے مروج کردہ تھے۔

نسائی کرداروں میں ایک اور اہم کردار ایلما کا ہے جو معاشرتی جکڑ بندیوں سے آزاد اپنی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایلما معاشرے کے ہر اصول کو توڑ کر اپنی دنیا میں سکون حاصل کرنا چاہ رہی ہے اور معاشرتی اصول و روایات کے ساتھ ساتھ مذہب سے بھی منحرف ہے اس کے تصور مذہب کو عصمت نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"اس کے کمرے میں بجائے یسوع کے کرشن کی تصویر لگی تھی جس کے آگے وہ سونے سے پہلے گھٹنے ٹیک کر بائبل کی آیتیں پڑھ کر سینے پر صلیب کا نشان بنایا کرتی تھی، وہ کہتی تھی "مجھے سفید رنگ سے گھن آتی ہے، اور صلیب پر لٹکے ہوئے مسیح پر رحم آتا ہے اور رحم کے ساتھ عقیدت کا جذبہ بجائے عبودیت کے دل میں بغاوت کی آرزو پیدا کر دیتا ہے، دوسری طرف ہنستے کھیلتے بنسری بجاتے کنہیا جی کو دیکھ کر دل ناچ اٹھتا ہے"(۳۵)

اسی طرح ایلما کے تصور مذہب کی مزید وضاحت کرتے ہوئے عصمت چغتائی ایلما کے خیالات کو یوں بیان کرتی ہیں:

"پھر ایک دم سے اسے نہ جانے کیا ہوا کہ کرشن کی تصویر نکال کر پھینک دی۔۔۔۔ لڑکیوں نے جب اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو وہ اپنے مخصوص قہقہے لگا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی "کشن جی کی بنسری کو کیڑا لگ گیا تھا، اس میں سے مینڈک ٹرٹرا رہا تھا"۔۔۔۔

"انھیں سوائے عورتوں سے مذاق کرنے کے اور کام ہی کیا تھا۔سنا ہے بیاہی عورتیں زیادہ پسند تھیں۔۔۔"(۳۶)

ناول میں ایلما ایک منفرد خود اعتماد کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے جسے سماج کی کوئی پروا نہیں ہے ،ہندوستانی معاشرے میں جہاں لڑکی کو شادی کے حوالے سے اپنی پسند ناپسند کے اظہار کی اجازت نہیں تھی تو وہاں نا جائز بچے کی پیدائش کو کیسے قبول کیا جا سکتا تھا۔ایلما ستیل کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اس کے بچے کو کسی صورت دنیا میں نہ لانا چاہتی تھی، وہ اس بات سے خائف نہیں تھی کہ دنیا والے ناجائز بچے کی پیدائش پر اسے تنقید کا نشانہ بنائیں گے بل کہ اس کے لیے ستیل کے بچے کو اپنے بطن میں پالنا مشکل تھا۔عصمت نے بچے کی پیدائش کے حوالے سے ایلما کو ایک مضبوط عورت دکھایا ہے جو ناجائز بچے کی پیدائش پر خائف نہیں ہے بل کہ مضبوطی سے حالت کا سامنا کرتی ہے۔یہاں ستیل کو کمزور اور ایلما کو طاقتور پیش کیا گیا ہے ، ستیل ایلما کو شادی کی پیشکش بھی کرتا ہے لیکن وہ محض جائز ناجائز سے بچنے کی خاطر اس سے شادی کر کے عمر بھر کی تکلیف کو گلے نہیں لگانا چاہتی۔جہاں عورت کو سماجی اصولوں سے انحراف کرتے دکھایا ہے وہیں مرد پر عورت کی فوقیت کا بیان بھی ملتا ہے اس سارے قصے میں ایلما کو ستیل سے زیادہ بااعتماد اور خود مختار دکھایا گیا ہے۔ عموماً اس طرح کے واقعات میں عورت کی طرف سے شادی کی صورت میں رحم کی اپیل کی جا رہی ہوتی ہے لیکن ایلما نے ستیل کی شادی کی پیشکش کو خود ہی ٹھکرا دیا اس کی مثال ٹیڑھی لکیر میں یوں ملتی ہے:

"۔۔۔شاید اگر ایلما عام عورتوں کی طرح روتی پیٹتی تو اس کے احساسات کچھ مختلف ہوتے۔ تھوڑا سا قانون اور سماج کا بھی ڈر ہوتا اور پھر وہ خود ہی یہ تجویز ایلما کے سامنے پیش کرتا مگر اب تو وہ اس کی حقارت بھری بے رحمی پر بھنا رہا تھا۔ویسے اسے اپنے حصہ کے ضائع جانے کی پروانہ ہوتی مگر یوں ایک بد دماغ لڑکی کو اسے ذلیل کرنے کا کیا حق تھا؟۔۔۔"(۳۷)

عصمت چغتائی نے ناول میں عورت کو کمزور نہیں دکھایا بل کہ ایک طاقت ور اور خود اعتماد عورت کا تصور پیش کیا ہے۔جو معاشرتی رسم و رواج کو در خور اعتنا نہیں سمجھتی۔پریا تابیتا نے ایلما کو Anti Social Personality قرار دیا ہے ،ان کے مطابق ایسے افراد اپنی جنسی ،سماجی اور ذاتی تسکین کے لیے قانون شکنی کرتے ہیں۔(۳۸)

ناول میں عصمت چغتائی نے جہاں معاشرتی رویوں کی عکاسی کی ہے وہاں کچھ حقائق سے پردہ بھی اٹھایا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت کمزور صنف ہے اور مرد کو اپنی طاقت کی بنا پر عورت پر برتری حاصل ہے لیکن عصمت نے اس کی تردید کی ہے ،ان کے مطابق عورت بظاہر کمزور دکھتی ہے لیکن در حقیقت وہ کمزور نہیں ہے ناول میں عصمت نے نسائی کرداروں سے متعلق اپنے نظریات کی پیشکش ان الفاظ میں کی ہے :

"یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں۔ شاید اس طرح خود ان کی کمزوری آڑ میں چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار کر اپنے ظلم کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ بزدل ہی شیر کی طرح گرج کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ مگر عورت؟ عورت اس حاکم کی طرح ہے جو "پر جا کا چاکر" بن کر انھیں الو بناتی ہے۔ اس کی چالیں کس قدر خطرناک اور پر اسرار ہیں بجائے شرمندگی کے اسے اپنی نسوانیت ایک بلند چیز نظر آنے لگی(۳۹)

عصمت چغتائی نے معاشرتی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ان پر طنز بھی کیا ہے ان کے مطابق انسان اچھے اور برے کا فرق سمجھنے میں ہی عمر تمام ہو ہے اور اپنے اصل مصرف و مقصد کو کہیں دور چھوڑ کر انسان معاشرے کی الجھنوں میں پھنس جاتا ہے۔ اس کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے :

"منجھو بیچاری ان جانوں میں سے تھی جو نہایت سلیقے سے پیدا ہوتی ہیں شریفوں کی طرح گھر میں رہیں پھر کوئی اللہ کا نیک بندہ لے گیا۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہی بچے پیدا کیے، پالے پوسے، پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ نے مٹی عزیز کر لی سب کے منہ سے نکل گیا واہ کیا جنتی بیوی تھی "(۴۰)

درج بالا اقتباس میں معاشرتی بے حسی اور بے جا اصولوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود سماجی الجھنوں میں گھیر کر عام کر دیتا ہے۔

ٹیڑھی لکیر میں ہندوستان کے متوسط طبقے کی عکاسی کی گئی ہے جس میں مختلف طبقات کے لوگوں کے احوال و اطوار بیان کیے گئے ہیں۔ ناول میں پڑھے لکھے طبقے کے ساتھ ساتھ عام گھریلو خواتین کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ عصمت نے گھریلو عورت کو عام عورت کی طرح گھر گرہستی میں مشغول دکھایا ہے۔ جس میں اس کا واحد مصرف افزائش نسل ہے اس کی اہم مثال شمن کی ماں کی ہے جو محض بچوں کی پیدائش پر معمور ہے اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد حیات نہیں ہے ناول میں اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں کہ :

"اماں کو تو دنیا کا بس ایک کام آتا تھا۔ اور وہ بچے پیدا کرنا۔ اس کے آگے نہ انھیں کچھ معلوم اور نہ ہی کسی نے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ ابا جان کو بچوں سے زیادہ بیوی کی ضرورت لاحق "(۴۱)

"اور یہ سب ابا کا قصور تھا، کیا مجال جو اماں دودھ پلا جائیں، ادھر بچہ پیدا ہوا، ادھر آگرے سے گولن بلوالی۔ دودھ پلوئے اور بیگم کی پٹی سے پٹی جڑی رہے۔(۴۲)

عصمت چغتائی نے اس رویے پر سخت تنقید کی ہے۔ اسی طرح سے متوسط طبقے کی گھریلو عورت کے مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے ایک اور مثال یوں دی ہے:

"لفظ بیوی کے خیال ہی سے شمن کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ نوری کے نوجوان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے، اور ہزاروں فکریں جونکوں کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں۔"(۴۳)

ناول میں عصمت چغتائی نے خود اعتماد پڑھے لکھے نسائی کرداروں کے ساتھ ساتھ گھریلو معاملات میں الجھے کردار بھی پیش کیے ہیں۔ اور معاشرے کے ساتھ ساتھ مردوں پر تنقید کی گئی ہے کہ وہ عورت کے معاملے میں کبھی بھی متوازن نہیں رہتے یا تو اسے ضرورت سے زیادہ عزت و تکریم سے نوازتے ہیں یا پھر بیوی کی صورت میں پاؤں کی جوتی کے برابر لا بٹھاتے ہیں۔ یہاں بیوی کے حوالے سے زیادہ برا رویہ روا رکھا جاتا ہے جس کی وجہ عورت کو اپنی ملکیت سمجھ لینا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد مرتضیٰ رقم طراز ہیں کہ:

"عصمت چغتائی کو مردوں سے یہ شکایت رہی ہے کہ اس نے عورت کو یا تو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا یا پھر تحت الثریٰ میں دھکیل دیا۔ لیکن اس کے تئیں معتدل رویہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ نہ ہی اس نے کبھی عورت کو اپنے برابر جانا اور نہ ہی کبھی ایک ہی صف میں شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا موقع دیا۔ اپنی نظر میں خود کو عورت سے بد تر ہی مانتا ہے وہ عورت کو پیار و محبت دے سکتا ہے لیکن اسے برابری کا درجہ نہیں دے سکتا۔ عورت مرد کی نظروں میں ہمیشہ ساری صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اس سے نیچے ہی رہی اور پھر اسے سراسر مجسمہ وفا بنا دیا گیا۔ اور اگر وہ صراط مستقیم سے کہیں ادھر ادھر ہوئی تو اسے گردن زدنی قرار دے دیا گیا، لیکن مرد بہر حال آزاد رہا، حتیٰ کہ بڑی سے بڑی لغزش بھی اس کی نظر کبھی نیچی نہیں کر سکی(۴۴)

یہاں عصمت چغتائی مردانہ فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کرتی ہیں کہ عورت معاشرے کا ایک اہم حصہ ہے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں لیکن ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک میں توازن آجائے تو معاشرہ بہتری کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔ اسی حوالے سے عصمت نے شمن اور رونی ٹلیر کی شادی کے واقعات قلمبند کیے ہیں۔ ان دونوں کی شادی کسی نے جبراً نہیں کروائی تھی بل کہ دونوں کی باہمی رضامندی سے انجام پائی تھی، لیکن معاشرے میں گورے مرد کے ساتھ کالی عورت کا ہونا ایک جرم سمجھا جاتا ہے اسی لیے شمن اور رونی دونوں کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا جو بالآخر ان دونوں کی علیحدگی پر ختم ہوئے۔ یہاں عصمت نے یہ تصور دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہمارے معاشرے کا ہی کوئی مرد گوری عورت سے شادی کر لے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کیوں کہ

وہ مرد ہے اور اسے معاشرہ اجازت دیتا ہے کہ وہ گوری عورت کو بیاہ کر لے آئے لیکن شمن چوں کہ عورت ہے اور اوپر سے کالی عورت ہے اس لیے اس کے لیے معاشرتی اصول بدل جاتے ہیں اور گورے مرد سے شادی کر لینا اس کی سب سے بڑی غلطی بن جاتا ہے۔ یہاں معاشرتی اصولوں پر سخت طنز کیا گیا ہے اور یہ تاثر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمام تر رکاوٹیں محض عورت ذات کے لیے ہیں مردان سب سے ماورا ہے۔

عصمت چغتائی نے ایسے کردار بھی پیش کیے ہیں جو روایتی گھریلو خواتین نہیں ہیں بل کہ عالمی صورتحال سے بھی واقف ہیں اس دور میں جہاں عورت کا گھر سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا وہاں عورت کا عالمی صوتحال سے واقف ہونا ایک بڑی بات تھی چنانچہ عصمت تک آتے آتے ناول میں ایسے کردار بھی شامل ہوئے جو عالمی صورتحال سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ دیس سدھار تحریکوں، اور دیگر رفاہ عامہ کی تحریکوں میں مردوں کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی۔ علاوہ ازیں عصمت نے ایک ایسی عورت کا تصور دیا ہے جو محض اپنی ملکی صورت حال سے آگاہ نہیں ہے بل کہ وہ عالمی صورتحال سے بھی بخوبی واقف ہے اور مشرق و مغرب میں ہونے والے تمام معاملات کو جانتی ہے، جرمنی اور روس کی جنگوں کے تمام حالات سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی دیش سدھار تحریکوں کی ایک سرگرم کارکن بھی ہے، وہ عورت معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کے اثرات کو بخوبی سمجھتی ہے اور نو آبادیاتی صورتحال سے واقف ہے، ترقی پسند تحریکوں کی سرگرم کارکن ہے، عصمت نے ایک ایسی عورت کا تصور دیا ہے جو قدیم رسوم ورواج سے منحرف ہے اور اپنی زندگی اپنی من مانی سے بسر کرنا چاہتی ہے۔

۵۔ روایت سے انحراف:

عصمت چغتائی نے اپنی تحریروں کو روایتی رنگ میں رنگنے کی بجائے انھیں ایک نئے رنگ میں رچا بسا کر پیش کیا ہے انھوں نے خیالات کی پیش کش میں روایت کی اندھی تقلید کے بجائے اسے جدید روش پر چلایا ہے یہ رنگ ان کے فن اور فکر دونوں میں جھلکتا ہے۔ فکری اعتبار سے دیکھا جائے تو عصمت نے ہندوستانی معاشرے کے افراد کی زندگی کے خارجی پہلوں پر لکھنے کے بجائے ان خارجی عوامل کے انسانی ذہن اور زندگی پر اثرات کو موضوع بنایا ہے، عصمت نے دوسرے ادیبوں کی طرح محض خارجی الجھنوں اور مسائل کے بیان پر اکتفا نہیں کیا بل کہ انھوں نے ان تمام مسائل کی وجہ دریافت کرتے ہوئے انسانی ذہن پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور انسان کی نفسیاتی کشمکش اور جنسی الجھنوں کو بیان کیا ہے۔ عصمت کو کرداروں کی نفسیات کا بیان کرنے میں کمال حاصل ہے۔

ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے روایت سے انحراف کی راہ اپناتے ہوئے ایسے کردار پیش کیے ہیں جو اسی زمانے میں رہتے ہوئے سماجی اصولوں سے منحرف ہیں، وہ سماجی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو جانے کے خواہش مند ہیں اور

اپنی روایات سے انحراف کرتے ہوئے بغاوت کی سطح تک پہنچ جاتے ہیں۔ شمن کے حوالے سے دیکھا جائے تو شمن ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہے جس کی بغاوت کا آغاز گھر میں ہی گھر والوں اور بڑی آپا کے ناروا رویوں، عدم توجہی اور نوری کے بلا وجہ کے موازنے سے ہوتا ہے۔ گھر سے اکتائی ہوئی شمن کا داخلہ جب بورڈنگ سکول میں کروادیا جاتا ہے تو وہ وہاں بھی انہی مشکلات سے دوچار رہتی ہے جو گھر میں موجود تھیں بل کہ اسے وہاں جنسی مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ سکول میں ہم جنسیت کے بڑھتے ہوئے رویے نے ایک طرف رسول فاطمہ کی وجہ سے اسے پریشان کیا تو دوسری طرف نجمہ کی محبت اور قربت کی خواہش اس کے دل میں کروٹیں لینے لگی۔ بعد ازاں لڑکوں کی طرف متوجہ ہو جانا اور ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا، بڑی عمر کے شخص سے اظہار محبت کرنا یہ سب ایسی باتیں تھیں جو ہندوستانی معاشرے میں رہتے ہوئے کرنا آسان نہ تھا لیکن شمن نے بے دھڑک کیا۔ اس کردار کا یہی جرات مندانہ اقدام اسے اردو ناول کے دیگر نسائی کرداروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

اگر اس دور کے حوالے سے دیکھا جائے جس میں ٹیڑھی لکیر تصنیف ہوا۔ تو جنسی موضوعات کے بارے میں لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا، عورت تو کیا مردوں کے لیے بھی اس موضوع پر لکھنے کی راہیں ہموار نہ تھیں لیکن عصمت نے اس معاملے کو معاشرتی مسئلہ سمجھتے ہوئے اس کی پیشکش کو معیوب نہ سمجھا بل کہ وہ معاشرے کی برائیوں کے خاتمے کے لیے ان پر پردہ ڈالنے سے زیادہ ان کے بیان کو ضروری سمجھا تا کہ ان مسائل کا سد باب کیا جا سکے۔ عصمت کے نزدیک برائی کو پردے کی اوٹ میں رکھ کر ختم نہیں کیا جا سکتا بل کہ اس کے خاتمے کے لیے اس کے منفی پہلوؤں کا بیان اور اس کی وجوہات کا معلوم ہونا زیادہ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نوجوان لڑکیوں کے جنسی مسائل کو خاص طور موضوع بنایا۔ عزیز احمد ٹیڑھی لکیر میں لڑکیوں کی ہم جنسیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ "لڑکیوں کے بورڈنگ ہاؤس کی یہ اندرونی تصویر اردو میں ایک بڑی نئی اور انوکھی چیز ہے"(۴۵)

عصمت نے نا صرف جنس کو موضوع بنایا بل کہ اس کے پس پردہ محرکات اور انسان کی نفسیاتی کشمکش اور حالات و واقعات کو بھی موضوع بحث بنایا۔ انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار اور نظریات کی پیشکش کے لیے روایات کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھا بل اپنے نظریات کا برملا اظہار کیا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں بنا شادی کے بچے کی پیدائش کو گناہ سمجھا جاتا ہے اور عصمت ان مذہبی اور سماجی اصولوں سے بخوبی واقف بھی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ انسانی فطرت کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے یوں لکھتی ہیں:

"۔۔۔ میں حرام حلال سب ایک ہی چیز سمجھتا ہوں۔ قدرت کے اصولوں کی پیروی کر کے پیدا ہونے والا جاندار ،انسان بننے کا حقدار ہے"(۴۶)

یعنی بچہ چاہے بنا شادی کے ہی ہوا ہو لیکن اس کی پیدائش فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہوئی اس لیے وہ انسان کہلانے کا پورا حق رکھتا ہے لیکن معاشرہ اسے ناکردہ گناہ کی سزا کے طور کبھی قبول نہیں کرتا۔یہاں عصمت نے معاشرتی اصولوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔اس حوالے سے وہ یوں رقمطراز ہیں:

"اور یہ سماج بنایا کس نے؟خود انڈا پھوٹ کر بچہ نکل آیا؟

"نہیں تو!"

"جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ سکتے ہیں۔"(۴۷)

عصمت کے کردار بھی معاشرتی جکڑ بندیوں سے فرار چاہتے ہیں اور اور معاشرے کی تشکیل نو کے حامی ہیں اور پابندیوں کے بجائے آزادی سے سانس لینا چاہتے ہیں۔شادی ایک فعل ہے قول نہیں(۴۸)

۶۔ معاشرے کی عکاسی:

ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے ،عصمت نے جہاں معاشرتی اصولوں سے انحراف کی راہ اپنائی وہاں ان بے جا اصولوں کی مخالفت بھی کی ہے۔انھوں نے غیر ضروری پابندیوں کو معاشرتی خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور ناول میں کرداروں کے افعال اور ماحول سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غیر ضروری رکاوٹیں انسانی شخصیت میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں اور انسان اپنے ماحول و معاشرے کے ہی زیر اپنے عمل اور رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔

عصمت چغتائی نے معاشرتی مسائل پر بحث کرتے ہوئے ان نام نہاد قواعد و ضوابط اور اصولوں کو نشانہ تنقید بنایا ہے جو محض معاشرے کے بنائے ہوئے ہیں اور ان سے مذہب بھی اپنا دامن نہیں بچا سکا اس کی ایک مثال بیوہ کی دوسری شادی میں رکاوٹ ہے۔مذہب کی رو سے دیکھا جائے تو اسلام میں عورت کو بیوگی میں دوسری شادی کرنے کی ممانعت نہیں ہے لیکن معاشرہ ان اسلامی اصولوں پر حاوی ہو جاتا ہے اور غلط اقدار و ضوابط کو انسان پر لاگو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ٹیڑھی لکیر میں شمن کی بڑی آپا اس کی ایک اہم مثال ہیں۔جو اپنے شوہر کی وفات کے بعد دو بچوں کے ساتھ اپنی ماں کے گھر مستقل رہائش اختیار کر لیتی ہیں۔جس سے گھر کا ماحول عجیب تر ہوتا چلا جاتا ہے، بڑی آپا اپنی محرومیوں کا ازالہ شمن پر بے جا تنقید کر کے بھی کرتی ہیں جس سے شمن کی شخصیت میں باغیانہ رویے جنم لینے لگتے ہیں، علاوہ ازیں بڑی آپا کو عام عورتوں کی طرح زندگی گزارنے کی اجازت بھی نہ تھی۔جس کی وجہ سے وہ ایک عجیب

احساس محرومی کا شکار ہو گئیں اور وہ ایسے منفی رویوں کی مرتکب ٹھہریں جن کی مذہب میں ممانعت ہے۔ جس میں عورتوں کی ہم جنسیت سر فہرست ہے۔

عصمت چغتائی نے بیوہ کی دوسری شادی نہ کرنے کے حوالے سے ایک اور مسئلے کا بیان بھی کیا ہے ان کے مطابق بیوہ کی دوسری شادی کروادینا خاندانی عزت و تکریم پر ضرب لگاتا ہے اس لیے بہت سی لڑکیاں اور خواتین باپ اور بھائیوں کی عزت کی خاطر پوری زندگی بیوگی میں بسر کر دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال ٹیڑھی لکیر میں یوں ملتی ہے:

"بڑی آپا ماں باپ کی عزت سمیٹے بیٹھی جیسے سارے گھر پر احسان کر رہی تھی۔ نفس کو مار کر اس میں حکومت کرنے کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں وہ باپ کی عزت کی خاطر اپنی نسوانیت کا خون کر رہی تھی۔۔۔"(۴۹)

اسی طرح تہواروں اور خوشی کے مواقع پر بھی بیوہ کے لیے بہت سی پابندیاں تھی۔ طنیعت کے بر خلاف ان پابندیوں پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے مزاج کی تلخی اور بد مذاقی کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

"وہ اب پہلے سے بھی زیادہ بد مزاج ہو گئی تھی گویا بیوہ ہو کر وہ بڑا تیر مار کر آئی تھی۔ چوڑیاں اور رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تو یہ سب لوگوں پر احسان نہیں تھا تو کیا تھا۔ رنڈاپے میں زندگی کے دن گزار کر وہ مرے ہوئے میاں کے ساتھ جیتے جاگتے، ساس سسر اور ماں باپ کا بھی تو سوگ کر رہی تھی۔ جب کوئی تہوار آتا تو وہ اپنا ناٹک شروع کر دیتی۔ ایک کونے میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور بین شروع کر دیتی۔ جلدی سے گھلی ہوئی مہندی پھنکوا دی جاتی۔ چوڑی والے کو ہش ہش کر کے ٹال دیا جاتا۔ سویوں کا زردہ پکنا ملتوی ہو جاتا۔ عید کی چاندنی ایسے ٹل جاتی جیسے اماں پر قرض آتی تھی یا وہ اپنی جان کا صدقہ دینے پر مجبور ہیں"(۵۰)

اسی طرح عصمت چغتائی نے سماجی رکاوٹوں کے ذریعے پیدا ہونے والے رد عمل پر بھی تنقید کی ہے اس کی ایک مثال بڑی آپا کا اپنی بیوگی کو ڈھال بنا کر پیش کرنا ہے۔ وہ اپنی اس کمزوری کو ڈھال بنا کر التفات کی طلب گار رہتی تھیں اور اپنے اور اپنے بچوں کے مفاد کے لیے کسی بھی قسم کے حیلے سے گریز نہ کرتی تھی۔ ان کے خیال میں یتیم ہونے کے ناطے ان کے بچے ہر چیز کے حقدار ہیں اس کی مثال یوں پیش کی گئی ہے:

"بڑی آپا حیرت زدہ ہو گئی۔ اندھیر ہے کہ نہیں، رانڈ بیوہ کا کسی کو خیال نہیں لوگ اپنی بیٹیوں کے آگے یتیم کا حق مارنے سے بھی نہیں چوکتے"(۵۱)

یہاں عصمت نے ان انسانی رویوں اور انسانی سرشت کی عکاسی کی ہے جو کسی بھی مجبوری یا محتاجی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتے بل کہ انسان کی اپنی شخصیت کا حصہ ہوتے ہیں۔ان رویوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ تمام تر سہولیات اور آسائشوں کو اپنا حق سمجھتے ہوئے اپنانا چاہتا ہے۔اس کی ایک مثال ذیل کی سطور میں پیش کی گئی ہے:

"۔۔۔علاوہ اس کی ذاتی صفات کے اس کی یتیمی کا سرٹیفکیٹ ہر جگہ کار آمد ثابت ہوا اور جلد ہی ایک نہایت مالدار اور اکلوتے لڑکے کو اس پر عاشق کرالیا گیا۔۔۔"(۵۲)

اسی طرح معاشرتی مسائل کے حوالے سے بات کرتے ہوئے عصمت نے انسانی رویوں کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔اس کے لیے انھوں نے ہر طبقے کے کردار پیش کیے جن میں عام گھریلو زندگی سے متعلقہ کردار بھی موجود ہیں اور پڑھے لکھے سرکاری عہدہ دار بھی۔شاعر، فلسفی اور دیگر معتبر کردار بھی موجود ہیں جنھیں سماج میں خاص اہمیت حاصل ہے۔اس حوالے سے سرکاری سکول کے ملازمین کا انسپیکشن ٹیم کے آنے پر سکول کی ملمع کاری کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔اس حوالے سے انسان کی دھوکہ دہی کی خصلت کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔سکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں پر جتنی بڑی قومی اور اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اتنا ہی عدم توجہی سے کام کرتے ہیں اور فرائض سے کوتاہی برتتے ہیں۔ٹیڑھی لکیر میں سماجی تنقید کے حوالے سے بات کرتے ہوئے شمیم حنفی یوں رقم طراز ہیں:

ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے ایک طرح کے نیم پختہ انسانیت دوستانہ وجودی رویے کی مدد سے اپنے معاشرے کو قدروں، روایتوں اور اداروں کو سمجھنے کی کوشش اپنے مشاہدات کی بنیاد پر کی ہے۔اس کوشش میں انھوں نے مسلمات پر ضربیں بھی لگائیں اور مذہب، معاشرت، ترقی پسندی کے معین تصورات کی بے تحاشا تنقید کی ہے۔(۵۳)

عصمت کے نزدیک ہندوستانی معاشرے کی زوال پذیری کا اصل محرک افراد کا اپنے پیشوں سے مخلص نہ ہونا ہے۔ان کے مطابق معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کا ایک ایک فرد اپنے تمام تر اختیارات اور ذمہ داریوں کو مخلصانہ طریقے سے پورا نہ کرتا ہو۔ہندوستانی معاشرے پر طنز کرتے ہوئے عصمت یوں رقمطراز ہیں:

"اول تو ہم ہندوستانی ہیں بدانتظامی، دھوکا، جعلسازی ہمارا پیدائشی حق، دوسرا ہمارا شمار پست اقوام میں ہے اب تو چپڑی اور دو دو! تم بیکار میں مغز پاشی کر رہی ہو"(۵۴)

معاشرتی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے عصمت نے سرکاری عہدہ داروں پر بھی طنز کیا ہے، عصمت نے فرائض سے روگردانی اور اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے عدم توجہی جیسے مسائل کو بطور خاص موضوع بنایا ہے

۔ سرکاری عہدہ داران محض ان مادی وسائل کی وجہ سے ملازمتیں کرتے ہیں اور اپنے منصب کی نزاکت کا قطعاً کوئی خیال نہیں کرتے بل کہ اس سے روگردانی کرتے نظر آتے ہیں۔اس کی مثال عصمت نے شمن کے زیر انتظام ملازمت کرنے والے سکول کے اساتذہ اور منتظمین کی دی ہے جو محض انسپکٹرس کو خوش کرنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں اور اپنے اصل مصرف سے ہٹ جاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انسانی سرشت پر گہری چوٹ کی گئی ہے کہ کس طرح اعلیٰ عہدہ داروں کو خوش کرنے کے لیے لوگ طرح طرح کی کوششیں کرتے ہیں اور اپنی اصل ذمہ داریوں سے پہلو تہی برتتے ہیں۔

انہی مسائل کی پیشکش کے ساتھ ساتھ عصمت نے امیر کی حاکیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ہندوستانی طبقے کی بیمار ذہنیت کی عکاسی کرتے ہوئے عصمت نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی قوم کمزور قوم ہے اور اس کی پسماندگی کی وجہ اس کا اپنا طرز زندگی اور سوچ ہے۔یہاں امیر کو اہمیت صرف اس کی امارت پر دی جاتی ہے اور ذات پات کے چکر میں الجھا ہوا فرد امیر کی جائز ناجائز تمام باتوں کو محض اس کے سرمائے کی وجہ سے مانتا ہے بھلے ہی وہ کسی منصب پر فائز ہو۔اس کی مثال ذیل کی سطور میں ملتی ہے:

> "حالاں کہ بچی نہایت گستاخی سے انسپکٹرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی،اور ادھر مارے خوف کے دراصل منیجر صاحب پیلے ہوئے جارہے تھے۔مگر بچی ٹس سے مس نہ ہوئی۔
>
> ابھی یوں ہی آتی ہے۔کلاس ولاس میں تو کچھ نہیں۔۔۔بڑے آدمی کی لڑکی ہے یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔"منیجر کو تمام گر یاد تھے۔"(۵۵)

ناول میں عصمت نے معاشرے کے اعلیٰ عہدے داروں پر بھی طنز کیا ہے۔خاص طور پر محکمہ تعلیم کو زیر بحث لایا گیا ہے جس کا مقصد قوم کو سدھارنا اور معاشرے کا ایک بہتر شہری بنانا تھا لیکن وہ محض مادی وسائل اور مسائل میں الجھ کر قومی ترقی سے بے نیاز بیٹھے ہیں اس کی مثال ناول میں یوں پیش کی گئی ہے:

> "محکمہ تعلیم کی عظیم الشان عمارت سے ذرا سی بھی علم کی ضو پاشی نظر نہ آئی۔تعلیم کاہے کو کوئی کاروباری ڈیپارٹمنٹ ہے۔ایک حصہ پر اسپتال کا شبہ ہوتا تھا۔گیلری میں ایک قطار سہمی ہوئی عورتوں کی بیٹھی تھی جو کسی نوکری یا وظیفے کی امیدواری میں آئی تھیں۔سب کی سب نہایت لاغر،بیمار،دکھیا اور نادار نظر آرہی تھی۔معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر شعبہ میں ناکام ہونے کے بعد پیٹ پالنے کا آخری سہارا محکمہ تعلیم ہی میں ملتا ہے۔"۔(۵۶)

اسی طرح انسانی سرشت پر بات کرتے ہوئے عصمت چغتائی یوں رقمطراز ہیں:

۔۔۔یہ بھولے بھالے گنوار بھی عجیب خصلت رکھتے ہیں یہ بہت جلد ایک مالک سے اکتا جاتے ہیں اور جب ایک رخ سے ناک رگڑتے رگڑتے گھس جاتی ہے تو سانس لینے کو دوسرے دیوتا کے آگے دوسرے رخ سے ناک گھسنے لگتے ہیں۔(۵۷)

عصمت چغتائی نے معاشرتی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ معاشرتی عدم توازن اور افراد کی عدم توجہی سے پیدا ہونے والے مسائل کی بہترین انداز میں پیشکش کی ہے انھوں نے فرد اور سماج پر گہری ضرب لگائی ہے۔انھوں نے معاشرتی مسائل اور بگاڑ کی وجہ فرد کو قرار دیا ہے اسی کی وجہ سے معاشرہ اس حد تک خرابی کا شکار ہوا ہے۔اس میں ایک اور مسئلہ معاشرتی بے حسی کا پہلو بھی ہے۔ایک ہی معاشرے میں رہتے ہوئے مختلف افراد کا باہمی سرد رویہ دراصل معاشرتی بے حسی کی علامت ہے۔ جس معاشرے میں احساس نہ رہے وہاں کبھی کوئی بہتری نہیں آسکتی۔اس کی مثال کے طور پر شمن کی ماں اور باپ سب سے پہلے آتے ہیں شمن کے باپ کا مصرف افزائش نسل اور جنسی تسکین کے علاوہ کچھ نہ تھا اسے کوئی احساس نہ تھا کہ اس کی بیوی اوپر تلے بچے کی پیدائش کے بعد کس جسمانی عارضے سے گزرتی ہو گی لیکن اس نے اسے بچے پیدا کرنے کی مشین سمجھتے ہوئے مشق جاری رکھی اور اتنے بچے پیدا کیے کہ ان کی تربیت تو در کنار ان کی خوراک تک کے بندوبست کے لیا انار کھنی پڑی۔ایسے ماحول میں ماں کی عدم توجہی کی وجہ سے شمن کے ساتھ بہنوں کا ناز یبا سلوک بھی بے حسی کی ایک مثال ہے۔ جس سے اس کی شخصیت میں بگاڑ پیدا ہوا اور وہ اپنی زندگی میں کسی بھی مرحلے پر مثبت رویہ اختیار نہ کر سکی بل کہ اس نے دنیا کو پرکھنے کے لیے ٹیڑھے پن کا مظاہرہ کیا۔

ناول ٹیڑھی لکیر کل ۴۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔جس میں نظریات کی پیشکش تین منزلوں میں کی گئی ہے۔جو دراصل شمن کی زندگی کی تین منزلیں ہیں، پہلی منزل میں پیدائش سے سکول تک کے زمانے کے حالات و واقعات کو پیش کیا ہے جہاں اسے تحقیر کی نگاہ ہی میسر تھی کوئی چاہنے والا، سمجھنے والا میسر نہ تھا، دوسری منزل سکول کے اس دور پر مشتمل ہے جہاں بہت سے چاہنے والے دوست میسر تھے لیکن نفسیاتی کشمکش اب بھی جاری تھی اور ایک لامتناہی تنہائی کا قرب جاری تھا۔ تیسری منزل کالج اور یونیورسٹی کے حالات و واقعات کا بیان کرتی ہے جو شمن میں بہت سی تبدیلیوں کا موجب بھی ہوتی ہے۔ یکا یک شمن کا ادب سے لگاؤ اور کالج کی یونین کا عہدے دار بن جانا، جلسوں میں شمولیت اختیار کرنا، افتخار اور ستیل کی طرف جھکاؤ وغیرہ۔ یہاں ایک اہم موڑ شمن کی شادی کا آتا ہے جہاں وہ ایک آئرش نوجون سے شادی کر لیتی ہے لیکن بچپن کی عدم توجہی نے اس کی شخصیت میں جس شکست خوردگی کو جنم دیا وہ دب نہ سکا ذات، رنگ و نسل اور دیگر تعصبات کی وجہ سے اس کی زندگی اجیرن ہو گئی اور رونی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔

عصمت چغتائی نے ناول میں شمن کی ذہنی و نفسیاتی کشمکش کو الفاظ کی صورت میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنی معنویت خود ابھارتے ہیں۔ نظریے کی تشکیل کے لیے عصمت نے موقع کی مناسبت سے مرکب اور مفرد دونوں طرح کے جملے استعمال کیے ہیں۔ بعض جگہوں پر مکالماتی انداز بھی اپنایا گیا اور نفسیاتی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے خود کلامی کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے:

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"انتہا!" اس نے سہم کر جواب دیا۔

"کوئی راستہ؟"

"ناممکن۔ خضر بھی بھٹک رہے ہیں۔"

"علاج؟"

"کوئی نہیں!"

"دعا"؟

"بیکار!" (۵۸)

عصمت چغتائی نے ناول میں محض کرداروں کے نفسیاتی تجزیے پر اکتفا نہیں کیا بل کہ ماحول اور معاشرتی مسائل کی تصویر کشی بھی کی ہے جو دراصل نفسیاتی و ذہنی دباؤ اور الجھنوں کا باعث بنتا ہے۔ اس کے لیے عصمت نے طنزیہ لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ عصمت کے طنزیہ لب و لہجہ کے حوالے سے سہیل بکاری یوں رقمطراز ہیں:

"روشن خیال عصمت کا قلم طنز نگاری میں بھی بے محابا دوڑتا ہے اور بعض اوقات تو طنز میں ناگوار حد تک شدت اور تلخی آجاتی ہے۔ (۵۹)

معاشرتی معاملات و مسائل کے ساتھ ساتھ افراد پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔ بچوں کی پیدائش کے حوالے سے وہ یوں رقمطراز ہیں:

""""نو بچوں کے بعد ایک کا اضافہ، جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی ہو اور دس بج گئے ہوں۔۔۔۔ "خدا غارت کرے اس منی سی بہن کو، اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی۔ (۶۰)

ایک اور جگہ اس کی مثال یوں ملتی ہے:

"۔۔۔یہ تو اسے خواب میں میسر نہ ہوا، اس نے خواب بھی سدا بھیانک اور ڈراؤنے ہی دیکھے، بھوتوں اور چڑیلوں کی دنیا کے"۔(۶۱)

اسی طرح اپنی ماں کے حوالے سے "اماں تمہیں بھی تو چمٹی ہوئی نادہند۔"(۶۲) میں طنز کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

فنی اعتبار سے بات کی جائے تو عصمت نے محاورات اور ضرب الامثال، تشبیہات و استعارات کا باقاعدہ استعمال کیا ہے اور ان کے بر محل استعمال سے جملے کی معنویت مزید بڑھ گئی ہے اس کی کچھ مثالیں ذیل کی سطور میں ہیں:

"تھوڑی دیر کے لیے کلیجے پر صبر کی سل رکھے بیٹھی رہتی۔(۶۳)

"دیکھیے اونٹ کس کل بیٹھتا ہے کس کی قسمت جاگتی ہے۔(۶۴)

سینے پر مونگ دلنا۔(۶۵)

تشبیہات و استعارات کے حوالے سے چند مثالیں ذیل میں ہیں:

آنگن میں نیم کا درخت بھوت کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا، سوکھے سوکھے پاگل کتیا کے سے بھیانک قہقہے (۶۶) موٹی سی بھیانک کتاب پتھر کی سل، زندگی کے دن ماضی کی تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے۔(۶۷)، دریچہ میں سے چاند ایک بادل کے نیچے سے گھسٹ گھسٹ کر نکل رہا تھا۔ اور ہوا ٹہنیوں میں سر سرا رہی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی صرف دور بہت دور جنگلی سیار خواب آلودہ قہقہے لگا رہے تھے۔(۶۸)، قیقت ننگی ہو کر ناچ رہی تھی۔(۶۹)

عصمت چغتائی نے نظریات کی پیشکش کے لیے ہندی اساطیر اور ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے جیسے پاپ اور پن کا چکر، اور اس کی ایک مثال یوں بھی ملتی ہے "گوپیوں کی طرح وہ مل جل کر ایک ہی کرشن کی بنسری کی لے پر ناچتیں"(۷۰)۔ انھوں نے ناول میں منظر نگاری کی بھی بہترین مثالیں پیش کی ہیں ان کی منظر نگاری کے حوالے سے جگدیش چندر ودھاون یوں رقم طراز ہیں:

"عصمت منظر نگاری میں بھی یکتا ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات منظر کو چند جملوں میں سمو کر یوں پیش کرتی ہیں کہ وہ کاغذ پر جی اٹھتا ہے۔ ان کا مشاہدہ باریک بینی اور دور رس چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور زبان پر ان کی قدرت اسے صفحہ قرطاس پر جوں کا توں منتقل کر دیتی ہے۔(۷۱)

اس کی مثال ناول میں یوں ملتی ہے:

"۔۔۔دور کہیں بہت سے گھنگروؤں کی جھنکار ہوا کو جاندار بنائے ہوئی تھی۔ یہ گھنگرو چڑیاں بجا رہی تھیں۔ بے تال سر چیں چیں بھی ملا کر بکھیر دیں کا الاپ معلوم ہو رہی تھی۔ سب ہی سر کومل تھے۔ نیم خوابیدہ احساسات کو

جمع کرنے کے لیے اس نے جاگنے کی کوشش کی۔ جسم کو آہستہ آہستہ سمیٹا اور پھر پھیلا دیا۔ پپوٹے کھولنے چاہے
مگر نہ کھلے جیسے سورج اس کی آنکھوں میں گھور رہا ہو۔۔۔(۷۲)

درج بالا سطور میں منظر نگاری کے ساتھ ساتھ جزیات نگاری کی مثال بھی موجود ہے عصمت نے منظر نگاری کرتے ہوئے اس کا خاص اہتمام کیا ہے۔ٹیڑھی لکیر میں فنی محاسن کے حوالے سے سہیل بخاری یوں رقمطراز ہیں:

"چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملے جچے تلے الفاظ اور محاورہ اور روزمرہ کی شستگی و صفائی ایسی خوبیاں ہیں جو قاری کو تھکن کا احساس نہیں ہونے دیتیں۔ان کے مکالمے بھی نہایت چست برجستہ اور فطری ہوتے ہیں"(۷۳)

یہ تحقیق ٹیڑھی لکیر کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے متن کا مطالعہ کرنے پر عصمت چغتائی کے فکر و فن کو سمجھنے میں معاونت ہوئی ہے۔ناول میں عصمت نے شمن کی صورت میں ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کی ہے جو ہندوستانی معاشرے میں رہتے ہوئے اس کی روایات سے منحرف ہے اور بغاوت کا علم بلند کرتی نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ عصمت معاشرتی رویوں کو قرار دیتی ہیں۔ناول شمن کے بچپن سے لے کر ایام جوانی اور بعد میں ملازمت اور شادی شدہ زندگی تک کا احاطہ کرتا ہے۔اس میں شمن کی ذہنی و نفسیاتی الجھنوں کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ شمن کے کردار اور اس کے شخصی رویوں سے عصمت نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ فرد کی شخصیت کی تشکیل میں معاشرہ اہم کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔ شخصی رویے مثبت اور منفی دونوں طرح کے برتاؤ سے جنم لیتے ہیں۔اگر فرد مثبت کردار کا حامل ہے تو اس میں اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ معاشرے کا کمال بھی موجود ہے لیکن اگر اس میں منفی رویے پروان چڑھ رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری بھی معاشرے اور گردونواح کے افراد پر آتی ہے۔ وہ شخص ذاتی طور پر قصوروار نہیں ہے۔

شمن کی پیدائش کے وقت اس سے پہلے بہت سے بہن بھائی موجود تھے اور اماں چونکہ محض افزائش نسل کی ذمہ دار تھیں اس لیے شمن کی تربیت کی ذمہ داری انا کے سپرد کی گئی جو خود ایک عشق میں مصروف تھی اور اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے شمن کے معاملے میں حد سے زیادہ لاپرواہی برتتی ہے اور اس کی ضروریات کو خاطر میں نہیں لاتی۔انا کے لیے شمن کی کم عمری اور اس کی ذہنی سطح کوئی معنی نہیں رکھتی۔اس لیے وہ ایک معصوم بچی کے سامنے اپنی جذباتی اور جنسی خواہشات کا اظہار بلا تامل کر دیتی ہے۔ایسے ماحول میں پرورش پانے والی شمن جذباتی طور پر ناآسودہ کردار کی صورت ڈھلنے لگتی ہے۔ یہاں عصمت نے فرد کے جنسی رویوں کو بھی بطور خاص ناول کا حصہ بنایا ہے ایک طرف عصمت جنسی مسائل کی عکاسی کرتی ہیں تو دوسری طرف یہ نظریہ بھی پیش کرتی ہیں کہ ماحول انسان کا سب سے

بڑا استاد ہے۔انسان اپنے ماحول اور مشاہدے سے چیزیں سیکھ رہا ہوتا ہے جو اس کے لاشعور میں موجود رہتی ہیں اور اسے اذیت سے دوچار کر دیتی ہیں۔ یہاں شمن کی جنسی خواہشات کی ذمہ داری کہیں نہ کہیں انا پر بھی جاتی ہے کہ وہ اس کے سامنے اپنی خواہشات کی تکمیل سے گریز نہیں کیا کرتی تھی اور ایک چھوٹی سی بچی اسے اس طرح بھبھوڑتے جھپٹتے دیکھ کر بوکھلا جایا کرتی تھی۔ لیکن یہ بوکھلاہٹ وقتی نہیں تھی بل کہ اس کے اثرات دیر پا ثابت ہوئے تھے۔ جہاں انا کی جنسی زندگی کے اثرات شمن پر پڑے وہیں انا کے جانے کے بعد منجھو کے حوالے کیے جانے پر اس کی نفرت کا سامنا کرنے پر وہ اور بھی پریشان ہو گئی اور اس کی شخصیت میں ایک اور بڑا جھول آ گیا لیکن شمن نے اس کا اظہار کبھی الفاظ سے نہ کیا بل کہ وہ اکثر توجہ کے حصول کے لیے عجیب و غریب حرکات کیا کرتی تھی جس کے نتیجے میں اسے اکثر مار کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ یہاں عصمت نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ والدین کی خاطر خواہ توجہ نہ ملنے پر بچے ذہنی تناؤ اور اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ایسے بچے خود کو غیر اہم تصور کرتے ہیں اور عدم توجہ کی وجہ سے ان کی شخصیت میں منفی رویے پروان چڑھنے لگتے ہیں۔اور وہ توجہ کے حصول کے لیے انتہائی قدم اٹھا لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ناول میں عورت کی نفسیاتی کشمکش کا بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے جس میں معاشرے اور اس کی بے جا پابندیوں کو اس کی سب سے بڑی وجہ بتایا گیا ہے۔ عصمت نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ فرد کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے۔اس بنیاد پر معاشرے یا کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ فرد پر بے جا پابندیاں عائد کرے۔ یہاں عصمت نے محض مرد کو مجرم نہیں قرار دیا بل کہ انھوں نے اجتماعی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے معاشرے اور معاشرتی رویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہماری روایات ہمارے لیے بیڑیاں بن جاتی ہیں۔

اسی طرح عورت کے حوالے سے بات کی جائے تو ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے عورت کو ظلم و زیادتی کی چکی میں پستی عورت کے روپ میں نہیں دکھایا بل کہ یہاں انھوں نے ایک آزاد عورت کا تصور دیا ہے جو اپنے لیے فیصلے لینے کا اختیار رکھتی ہے۔اور کسی بھی فرد کے تابع نہیں آتی۔ ناول کا مرکزی کردار شمن اس کی سب سے اہم مثال ہے۔ جو اپنی خواہشات اور پسند کے آگے کسی کو بند باندھنے کا اختیار نہیں دیتی اور اپنی زندگی کو اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطابق بسر کرنا چاہتی ہے۔ یہاں عصمت نے قدیم ہندوستانی معاشرے میں پرورش پانے والی ایک ایسی جدت پسند لڑکی کی تصویر کشی کی ہے جو خود کو دیرینہ رسومات سے آزاد تصور کرتی ہے۔اور ان رسومات کو جڑ سے ختم کر دینا چاہتی ہے۔ شمن کا کردار اسی معاشرے کا جیتا جاگتا کردار ہے۔اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت ناول میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ کردار جذباتی طور پر ناآسودہ اور مضطرب کردار ہے۔ جس سے معاشرتی رویوں نے ایک صحت مند زندگی

گزارنے کا حق چھین لیا ہے۔ عصمت نے اس کردار کی کجیوں اور خامیوں کو دراصل اس کی ذہنی ونفسیاتی الجھنوں کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے اسے حد سے زیادہ اچھا بنا کر پیش نہیں کیا بل کہ اس کی شخصیت کے تاریک پہلوں کا بطور خاص منظر عام پر لایا گیا ہے۔

شمن کے علااوہ ایلما بھی ایک مضبوط کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ جس سے اس دور کے بدلتے تناظر کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ دور اب ویسا نہیں رہا تھا کہ عورت کو چار دیواری میں مقید کر کے دین دھرم کو اپنی من مانی سے اس پر لاگو کر کے پابہ زنجیر کر دیا جائے۔ بل کہ عصمت کی عورت ایک ایسی عورت کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے جو اپنی مرضی سے سانس لینا جانتی ہے اور ایک صحت مند زندگی گزارنے کا واضح نصب العین بھی رکھتی ہے۔ اپنی مرضی اور پسند کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آئیڈیل بھی رکھتی ہے۔ مصنفہ نے ایلما کی صورت میں ایک ماڈرن لڑکی کی تصویر کشی کی ہے جو حلال و حرام سے ممیز اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایلما کے ہاں ناجائز بچے کی پیدائش کے وقت اس کا ستیل کو شادی سے انکار کر دینا اس قدیم ہندوستانی تصور عورت سے انحراف کرتا ہے کہ اگر پہلے کبھی ایسا ہو جائے تو لڑکی خود شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور اپنی اور خاندان کی عزت بچانے کی خاطر خود کو قربان کر دیتی ہے، لیکن ایلما کی صورت میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ابھرتا ہے جو اس بات سے بے نیاز ہے کہ ناجائز بچے کی پیدائش پر زمانہ کیا کہے گا بل کہ وہ ایسے شخص کے بچے کو پیدا کرنے سے گریزاں ہے جو اس کی پسند ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ستیل کا شادی کے لیے اظہار اسے گراں گزرتا ہے، یہ عصمت ہی کا کارنامہ ہے کہ قدیم ہندوستانی معاشرے میں رہتے ہوئے ایسا نسائی کردار تخلیق کیا جو روایتی ڈھانچے کو پاش پاش کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ضمنی کرداروں میں عصمت نے معاشرتی معاملات میں الجھی عورت کی تصویر کشی بھی کی ہے جو اب بھی اپنے لیے فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں شمن کی ماں کا کردار اس قدیم روایتی عورت کی تصویر پیش کرتا ہے جو محض بچے پیدا کرنے پر معمور ہے اور اس کے علاوہ اس نے اپنا کوئی مصرف نہیں سمجھا یہاں عصمت نے مردانہ سوچ پر بھی کاری ضرب لگائی ہے اور مرد کو عورت کے استحصال کی وجہ قرار دیا ہے۔ یہاں عصمت نے مرانہ معاشرے تنقید کرتے ہوئے، مرد کو محض جنسی لذتوں میں گھرا دکھایا ہے۔ عصمت کے نزدیک مرد نے عورت کو محض خاندان کی بڑھوتری کا آلہ کار سمجھ لیا ہے، یہ پدرسری معاشرے پر سخت تنقید کی ایک صورت ہے۔

عصمت نے اپنے ناول میں عورت کو بااعتماد اور مضبوط کردار کے طور پر پیش کیا ہے بل کہ انھوں نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے عورتیں یوں ہی اپنی بے چارگی کا رونا روتی رہتی ہیں اصل بے چارے تو مرد ہیں

جو اپنی مردانگی کی وجہ سے اپنے مسائل کا بیان بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں عصمت اس تانیثی رویے کی مخالفت کرتی نظر آتی ہیں اور یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ عورت کو بھی معاشرے میں مقام حاصل ہے اور محض مرد ہی عورت کا استحصال نہیں کرتا بل کہ ہر طاقتور شخص کمزور کا استحصال کرتا ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت یہ استحصال ہر سطح پر جاری وساری نظر آتا ہے۔

ناول میں عصمت نے ان معاشرتی رویوں کی عکاسی بھی کی ہے جو زندگی کا دائرہ مزید تنگ کر دیتے اور فرد کی مشکلات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ جن میں ایک مسئلہ بیوہ سے دوسری شادی کا حق چھین لینا ہے۔ عصمت نے یہاں معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ یہ رکاوٹیں معاشرتی بگاڑ کا باعث بن جاتی ہیں اس کی مثال شمن کی بڑی آپا کا کردار ہے۔ جو اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنی ماں کے گھر آکر رہنے لگی۔ آپا کو یہ موقع میسر نہ آیا کہ وہ دوسری شادی کر سکیں تو انھوں نے کہیں اپنے یتیم بچوں میں تو کبھی محلے کی خاتون کے آنچل میں سہارا ڈھونڈنے کی کوشش کی یہ جنسی خواہشات کا غلط طریقے سے انخلا ہے۔ ایسے گھٹن زدہ ماحول میں رہتے ہوئے ایک صحت مند انسان بھی بیمار ذہنیت کا مالک بن جاتا ہے۔ جنسی اور جذباتی زندگی پر لگائی جانے والی یہ قدغنیں جب غلط طریقے سے اظہار پانے لگتی ہیں تو معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔

جنسی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے عصمت نے تعلیمی اداروں کے ماحول پر سخت تنقید کی ہے۔ اور کم عمر بچیوں کے جنسی معاملات میں ملوث ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس سارے بگاڑ کا ذمہ دار ماحول اور معاشرے کو قرار دیتی ہیں۔ عصمت نے یہاں ان معاشرتی عہدہ داروں پر کڑی تنقید کی ہے جو اپنے فرائض سے عدم کوتاہی برت رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو رہا ہے۔ جن میں ملا و استاد کے کردار پر خاص طور پر تنقید کی گئی ہے۔ یہاں عصمت نے ملا اور استاد کے کردار کو بھی ان سب برائیوں میں ملوث دکھایا گیا ہے۔ ایک طرف ملا جنسی ہوس میں مبتلا ہو کر جذباتی ہیجان کے فروغ کا باعث بن رہے ہیں۔ تو دوسری طرف اساتذہ اپنے فرائض سے کوتاہی برت کر نئے اذہان کی پراگندگی میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔

ال مختصر عصمت نے روایت سے منحرف ہو کر ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو قدیم رسوم سے محض باغی ہی نہیں ہے بل کہ اپنا ایک واضح نصب العین رکھتا ہے۔ جس دور میں یہ ناول تصنیف کیا گیا وہ دور عورت کے لیے اپنے نظریات اور خیالات کے برملا اظہار کے لیے موزوں نہیں تھا تاہم عصمت چغتائی نے ہر پابندی اور رکاوٹ کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے نظریات کا اظہار صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں انھوں نے عورت کو معاشرے کے ایک فعال

رکن کے طور پر پیش کیا ہے۔ جو پدر سری معاشرے میں رہنے کے باوجود اپنا ایک واضح نصب العین رکھتی ہے اور اپنی زندگی کے فیصلوں میں خود مختار ہے۔

حوالہ جات

۱ طفیل جعفری، مشمولہ، عصمت چغتائی شخصیت اور فن، مرتبہ ایم سلطانہ بخش(اسلام آباد: ورڈویژن پبلشرز، ۱۹۹۲)، ص ۳۰۷، ۳۰۸۔

۲ سنبل نگار، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، (لاہور: ۲۰۱۳)، ص ۱۳۶۔

۳ ڈاکٹر یوسف سرمست، "عصمت چغتائی کی ناول نگاری، مشمولہ "عصمت چغتائی شخصیت اور فن، مرتبہ ایم سلطانہ بخش، (اسلام آباد: ورڈویژن پبلشرز، ۱۹۹۲)، ص ۷۷۴۔

۴ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵)، ص۔ ۲۰۱

۵ شبنم رضوی، عصمت چغتائی کی ناول نگاری ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں، (دہلی: نیو پبلک پریس۔ ۱۹۹۲)، ص ۱۲۷۔

۶ پروفیسر عبدالسلام، ڈاکٹر عبدالحق حسرت، عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول، (دہلی: اعجاز پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹)، ص ۴۹۔

۷ قمر رئیس، مشمولہ ٹیڑھی لکیر میں نفسیاتی الجھنیں، از شبنم رضوی، عصمت چغتائی کی ناول نگاری ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں (دہلی: نیو پبلک پریس، ۱۹۹۲)، ص ۱۲۷۔

۸ خلیل الرحمٰن اعظمی، بحوالہ نیلم فرزانہ، اردو ادب کی خواتین ناول نگار، (لاہور: فکشن ہاؤس ۱۹۹۲، ص ۸۷۔

۹ عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، (لاہور: مکتبہ اردو، ۲۰۰۱)، ص ۳۱۲۔

۱۰ ایضاً، ص ۴۰۔

۱۱ ایضاً، ص ۳۴۳۔

۱۲ ایضاً، ص ۲۰۶۔

۱۳ ایضاً، ص ۲۴۶۔

۱۴ ایضاً، ص ۱۹، ۲۰۔

۱۵ ایضاً،ص ۱۳۱۔

۱۶ پروفیسر عبدالسلام،ڈاکٹر عبدالحق حسرت،عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول،ص ۴۴۔

۱۷ ٹیڑھی لکیر،ص ۶۰۔

۱۸ ایضاً،ص ۷۳۔

۱۹ ایضاً،ص ۱۴،۱۳۔

۲۰ ایضاً،ص ۱۹۶۔

۲۱ ایضاً،ص ۸۴،۸۳۔

۲۲ ایضاً،ص ۸۶۔

۲۳ عزیز احمد،عصمت کی ٹیڑھی لکیر،مشمولہ،عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر،مرتبہ ڈاکٹر جمیل اختر،(نئی دہلی: انٹر نیشنل اردو فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱)،ص ۳۶۵۔

۲۴ پروفیسر عبدالسلام،ڈاکٹر عبدالحق حسرت،عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول،ص ۵۱۔

۲۵ ٹیڑھی لکیر،ص ۲۶۳،۲۶۲۔

۲۶ ایضاً،ص ۱۴۴۔

۲۷ ایضاً،ص ۸۵۔

۲۸ ایضاً،ص ۸۵۔

۲۹ صفیہ اختر،بحوالہ،ڈاکٹر یوسب سرمست،"عصمت چغتائی کی ناول نگاری،مشمولہ،"عصمت چغتائی شخصیت اور فن،مرتبہ ایم سلطانہ بخش،ص ۴۸۵۔

۳۰ ٹیڑھی لکیر،ص ۱۰،۹۔

۳۱ ایضاً،ص ۳۵۔

۳۲ ترنم ریاض(مرتب)،بیسویں صدی میں خواتین کا ادب،(نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۴)،ص ۱۶۔

۳۳ ٹیڑھی لکیر،ص ۳۰۷۔

۳۴ ایضاً،ص ۲۵۰۔

۳۵ ایضاً، ص۱۷۰۔

۳۶ ایضاً، ص۱۷۰۔

۳۷ ایضاً، ص۲۶۴۔

۳۸ پریا تابیتا، اردو ناول کے منفی کردار: آغاز تا قیام پاکستان، (لاہور: خرم بکس، ۲۰۰۶)، ص۲۴۸۔

۳۹ ٹیڑھی لکیر، ص۲۵۰۔

۴۰ ایضاً، ص۶۵، ۶۴۔

۴۱ ایضاً، ص۴۸۔

۴۲ ایضاً، ص۱۰۔

۴۳ ایضاً، ص۲۳۶۔

۴۴ ڈاکٹر محمد مرتضیٰ، اردو فکشن میں خواتین کے مسائل اور موضوعات، مشمولہ، اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں۔ مرتبہ صالحہ صدیقی، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴)، ص۱۳۳۔

۴۵ عزیز احمد، عصمت کی ٹیڑھی لکیر، مشمولہ، عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر، ص۳۶۲۔

۴۶ ٹیڑھی لکیر، ص۲۴۳۔

۴۷ ایضاً، ص۲۴۲۔

۴۸ ایضاً، ص۲۴۱۔

۴۹ ایضاً، ص۵۲۔

۵۰ ایضاً، ص۵۰۔

۵۱ ایضاً، ص۱۵۰۔

۵۲ ایضاً، ص۲۰۶۔

۵۳ شمیم حنفی، عصمت کی ٹیڑھی لکیر، مشمولہ، عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر، مرتبہ ڈاکٹر جمیل اختر، (دہلی: انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱)، ص۳۷۵، ۳۷۴۔

۵۴ ٹیڑھی لکیر، ص۲۹۷

۵۵ ایضاً، ص۲۹۸

۵۶ ایضاً، ص۳۰۳

۵۷ ایضاً، ص۳۲۷

۵۸ ایضاً، ص۴۲۴

۵۹ سہیل بخاری، "عصمت کے دو ناول ،ضدی اور ٹیڑھی لکیر، مشمولہ، عصمت چغتائی نقد ی کسوٹی پر، ص۳۹۲،۳۹۱۔

۶۰ ٹیڑھی لکیر، ص۱

۶۱ ایضاً، ص۲۱۰

۶۲ ایضاً، ص۵۵

۶۳ ایضاً، ص۱۴

۶۴ ایضاً، ص۱۵۲

۶۵ ایضاً، ص۵۲

۶۶ ایضاً، ص،۳،۳۷

۶۷ ایضاً، ص۲۳

۶۸ ایضاً، ص۳۲۳

۶۹ ایضاً، ص۳۵۹

۷۰ ایضاً، ص۱۵۳

۷۱ جگدیش چندر ودھاون، عصمت چغتائی شخصیت اور فن، (نئی دہلی: مہرہ آفیسٹ پریس، سن ندارد)، ص۴۰۱-۴۰۰

۷۲ ٹیڑھی لکیر، ص۴۳۰

۷۳ سہیل بخاری، "عصمت کے دو ناول ،ضدی اور ٹیڑھی لکیر، مشمولہ، عصمت چغتائی نقد ی کسوٹی پر، ص۳۹۱

باب چہارم:

اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا تقابلی مطالعہ

باب چہارم:

اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا تقابلی مطالعہ

اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر دونوں ناول ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ دونوں مصنفین نے معاشرتی مسائل کی پیشکش اپنے اپنے نظریات کے تحت منفرد انداز میں کی ہے۔ نذر سجاد حیدر کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے ناول نگاری کے دورِ اولیں میں لکھنا شروع کیا۔ اس دور میں ناول نگاری کی صنف اپنے ارتقائی مراحل میں تھی اور موضوعات بھی محدود تھے۔ وہ دور عورت کی تعلیم و ترقی کے لیے ہموار نہیں تھا اسی لیے نذر سجاد حیدر نے خواتین کو شعور و آگہی دلانے کی کوشش کی اور اپنی تحریروں کے ذریعے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی کہ تعلیم ہر شخص کا بنیادی حق ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، دونوں معاشرے کے فعال رکن ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے معاشرے کو جنسی تفریق سے ہٹ کر سوچنے کی ترغیب دی اور مرد و زن کو معاشرے میں برابری کا درجہ دیا۔ مصنفہ نے اپنے نظریات کی پیشکش کے لیے عورتوں کی تعلیم و ترقی کے حوالے سے درپیش مسائل کی عکاسی کی ہے۔ اختر النسا بیگم میں مرکزی کردار بظاہر تو پڑھا لکھا ہے لیکن اپنی سوتیلی ماں کی کم علمی اور کی وجہ سے اسے زندگی کا سفر کٹھن معلوم ہوا۔ نذر سجاد حیدر نے معاشرتی رویوں پر سخت تنقید کی ہے جو انسان کو مرد یا عورت میں تفریق کر کے ان سے جینے کا بنیادی حق چھین لیتا ہے۔ اختر النسا بیگم کی تخلیق سے پہلے بہت سے مصنفین نے اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرتی اصلاح کی خدمات سرانجام دیں۔ یہ ناول بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں معاشرتی اصلاح اور خاص کر اصلاح نسواں کی تحریک کو فروغ دیا گیا۔

عصمت چغتائی کا تعلق ناول نگاری کے ترقی یافتہ دور سے تھا۔ ٹیڑھی لکیر کی تصنیف کے وقت اردو ناول اپنی ارتقائی منازل طے کر چکا تھا اور اس کی مکمل صورت سامنے آچکی تھی اور موضوعاتی اعتبار سے بھی متنوع موضوعات اس صنف کا حصہ بن چکے تھے۔ تاہم یہ عصمت چغتائی کا ہی خاصہ ہے کہ وہ ٹیڑھی لکیر میں کرداروں کی ذہنی و نفسیاتی الجھنوں اور جنسی مسائل کو جس کامیابی سے احاطہ تحریر میں لائی ہیں وہ ان سے قبل مرد مصنفین کے

ہاں بھی نہیں ملتا۔ عصمت چغتائی نے نا صرف اس دور کے ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے بل کہ اپنے مشاہدے اور کمال فن سے وہ کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کرنے اور جانچنے میں بھی کامیاب ہوئی ہیں۔ انھوں نے معاشرتی مسائل کے پیش نظر فرد کے ذہن پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سے پہلے خارجی معاملات و موضوعات پر لکھا گیا تھا انھوں نے فرد کی داخلی دنیا اور کیفیات کو اپنا موضوع بنایا۔ دونوں ناولوں کا تقابلی جائزہ ذیل کی سطور میں کیا گیا ہے۔

ا تصور عورت:

دونوں ناولوں کا مرکزی کردار عورت ہے۔ اور دونوں ناول عورت کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اختر النسا بیگم میں اختر کے حالات و واقعات کا بیان ہے اور ٹیڑھی لکیر میں شمن کی ذاتی زندگی اور اس کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کا بیان ہے۔ تصور عورت کے حوالے سے بات کی جائے تو دونوں مصنفین نے منفرد کرداروں کی پیشکش کی ہے جو اپنے ارتقائی مراحل میں ہیں۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جب عورت کا لکھنا اور پڑھنا تک معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے میں اختر النسا کا اپنے گھر سے دور رہ کر تعلیم حاصل کرنا اور اعلیٰ تعلیم کے حصول سے اپنے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا ایک انتہائی قدم تھا۔ اگرچہ نذر سجاد نے اختر کو ایک کمزور بے بس کردار کی صورت میں دکھایا ہے لیکن کہیں نہ کہیں انھوں نے تعلیمی قابلیت اور اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اختر کی سوتیلی والدہ کا کردار ایک زبردست منفی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے جس کے فیصلوں کے آگے مرد بھی جھکنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنے تمام فیصلے ہوشیاری اور سمجھداری کے ساتھ کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی ایسی خواتین موجود تھیں جو اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کو منوانا جانتی تھیں۔ مرکزی کردار کے حوالے سے بات کی جائے تو اختر کو بظاہر کمزور دکھایا گیا ہے لیکن یہاں چونکہ مقصود پڑھی لکھی اور ان پڑھ عورت میں تمیز کروانا تھا اسی لیے اختر کو اپنی والدہ کی سختیوں اور رکاوٹوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ وہ دور چونکہ تعلیم نسواں کے لیے سازگار نہ تھا اسی لیے نذر سجاد نے معاشرتی صورتحال کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسی عورت کی تصویر کشی کی ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنی روایات سے جڑی ہوئی ہے تاکہ آئندہ آنے والی خواتین کے لیے یہ در بند نہ ہو جائیں لیکن آخر میں اختر النسا کو ایک کامیاب عورت کے روپ میں دکھایا گیا ہے جس سے تعلیم یافتہ عورت کی خود مختاری اور تعلیم کی اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے۔ نذر سجاد حیدر نے عورت کی خود مختاری کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ وہ عورت کو خود مختار اور بااختیار دیکھنا چاہتی ہیں لیکن معاشرتی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے نظریے کی پیشکش کی ہے۔ اختر النسا بیگم کے حوالے سے قرۃ العین حیدر یوں رقم طراز ہیں:

"امی نے چودہ برس کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند ناول لکھا۔ جس کی ہیروئین اختر النسا بیگم نے مردوں کے معاشرے سے مظالم کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا اور آخر میں فتح مند ہوئی۔(۱)

یہاں قرۃ العین حیدر کی اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اختر النسا فتح مند تو ہوئی لیکن وہ معاشرے کے مردوں کے ہاتھوں استحصال کا نشانہ نہیں بنیں بل کہ اس کی اپنی سوتیلی ماں نے اسے مشکلات سے دوچار کیا۔ نذر سجاد حیدر نے محض مرد کو مجرم نہیں ٹھہرایا بل کہ انھوں نے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ مرد خود عورت کے ہاتھوں مشکلات کا شکار ہے۔ یہاں انھوں نے استحصال کی ذمہ داری محض مرد پر نہیں ڈالی بل کہ پورا معاشرہ اس کا ذمہ دار ہے جو انسان سے اس کے جینے کا بنیادی حق بھی چھین لیتا ہے۔

دوسری طرف عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کی گئی ہے جو حالات و واقعات کے آگے ہارنے والی نہیں ہے اس میں اتنی طاقت اور ہمت موجود ہے کہ وہ مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹی رہے۔ ناول کا مرکزی کردار شمن ہے جو روایتی عورت کے تصور سے یکسر مختلف نظر آتی ہے اور زندگی گزارنے کا اپنا ایک نصب العین رکھتی ہے۔ شمن کی پیدائش ایک ایسے گھر میں ہوئی جہاں پہلے ہی بہت سے بچے موجود تھے اسی لیے وہ عدم توجہی کا شکار بھی رہی۔ جس سے اس کی شخصیت میں منفی رویے پروان چڑھنے لگے، لیکن وہ ایک مضبوط کردار کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

شمن کی ماں کے حوالے سے بات کی جائے تو وہ اسی روایتی عورت کی تصویر ہے جس کا مقصد حیات خاندان کی بڑھوتری ہے اور اس کے پاس اولاد کی تربیت تک کے لیے وقت نہیں۔ شمن کی ماں پدر سری معاشرے کی ایک مجبور عورت کے طور پیش کی گئی ہے جسے بچے پیدا کرنے کی مشین سمجھا گیا اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مصرف نہیں جانا گیا۔ لیکن شمن اس سے یکسر مختلف کردار کی صورت میں ابھرتی ہے جو اپنی ازدواجی زندگی کو کسی بھی سمجھوتے کے تحت گزارنا اپنی تحقیر سمجھتی ہے۔ شمن کا کردار اس ہندوستانی معاشرے سے منحرف اور باغی کردار ہے جو نسائیت کے نام پر لگائی جانے والی پابندیوں سے خود کو آزاد تصور کرتی ہے۔ شمن ان تمام معاشرتی رویوں سے منحرف ہے جو عورت کی آزادی اظہار پر لگائی جانے والی پابندیوں کو قابل تحسین سمجھتے ہیں۔ اسے اپنی ذات میں موجود خوبیوں اور صلاحیتوں کا پوری طرح سے ادراک ہے اس لیے وہ کسی بھی قسم کی جکڑبندیوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر کا ایک اور اہم نسائی کردار ایلما ہے جو ہندوستانی معاشرے کے نام نہاد اصولوں سے باغیانہ رویہ اختیار کرتی ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں جہاں لڑکی کا اپنی مرضی سے شریک حیات کا انتخاب کرنا بھی معیوب

سمجھا جاتا تھا۔ وہاں اس نے بنا شادی کے ایک بچے کو جنم دے کر ہندوستانی معاشرے کی فرسودہ بنیادوں کو متزلزل کر دینے کی ہمت کی۔ اور بعد میں روایتی ماں کے کردار سے بھی انحراف کیا۔ اس کے نزدیک سماج بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا بل کہ اصل اہمیت ذات کی ہے۔ عصمت چغتائی نے سماجی رویوں پر طنز بھی کیا ہے اور روایتی تصور عورت کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

> "عورت! کیا یہی تھی عورت جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح سجا بنا کر کل ایک نئے مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی۔۔۔ یہ وقتی وارنش دو چار گھسوں میں اتر جائے گی اور دلہن صرف بیوی بن کر رہ جائے گی! لفظ بیوی کے خیال ہی سے شمن کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ نوری کے نوجوان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے، اور ہزاروں فکریں جونکوں کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں" (۲)

دونوں ناولوں کے مرکزی نسائی کرداروں کا تقابل کیا جائے تو ایک واضح ارتقائی شکل سامنے آتی ہے۔ ایک طرف اختر النسا بیگم ہے جو باشعور ہونے کے باوجود معاشرتی دباؤ، رکھ رکھاؤ اور لحاظ کی وجہ سے اپنے لیے کسی قسم کا فیصلہ نہ کر پائی اور ظلم سہتی پیکر وفا و شعار بنی رہی لیکن جب ظلم اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اس نے اپنے لیے انتہائی قدم اٹھایا۔ تو دوسری طرف شمن ہے جو زندگی میں ظلم سہنا تو در کنار کسی چھوٹی سی بات پر بھی اپنی ذات کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتی۔ بل کہ حالات سے ٹکر لینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

اختر النسا بیگم کے ان پڑھ خاندان میں بیاہے جانے اور ایلما اور شمن کے شادی کے حوالے سے تصورات کا تقابل کیا جائے تو ٹیڑھی لکیر کے کردار زیادہ فعال نظر آتے ہیں۔ جہاں عورت کی اپنی ذات اور اس کی محسوسات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اختر النسا کی شادی ایک ایسے گھر میں کی گئی تھی جہاں اس کا واسطہ اخلاقی طور پر گرے ہوئے جاہل خاندان سے پڑا اور انھوں نے اس کے لیے مسائل کھڑے کیے لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی شرم و لحاظ کی پتلی بنی روایتی عورت کی طرح مجبور اور بے بس کردار کے طور پر سب سہتی رہی۔

ڈاکٹر عبدالخلیل کشش کے مطابق:

> نذر سجاد نے اپنے دوسرے ناول اختر النساء میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر کافی زور دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اگر لڑکی پڑھی لکھی ہوگی تو اپنی عقل اور اپنے شعور سے زندگی کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے۔ (3)

یہی صورت اختر النسا بیگم کی ہے جو اپنی زندگی کی مشکلات پر اپنے علم و عمل کی بنیاد پر قابو پا لیتی ہے۔ لیکن ٹیڑھی لکیر میں صورتحال یکسر مختلف ہے، اس ناول میں عورت خود مختار ہے وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور اگر کسی قسم کے مسئلے سے دوچار ہو بھی جائے تو حالات کو سلجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ شمن

کے کردار کے حوالے سے بات کی جائے تو وہ ایک خود مختار لڑکی ہے جو شادی کے معاملے میں ہندوستانی روایات سے منحرف ہے اس نے نا صرف اپنی پسند سے شادی کی بل کہ غیر مذہب، غیر ملک کے شخص سے شادی کی اور بعد میں جب اس کے ساتھ بھی نباہ نہ کر پائی تو بندھن ختم کر دیا۔ دونوں ناولوں میں ایسے نسائی کردار موجود ہیں جو کہیں نہ کہیں خود مختار ہیں لیکن ٹیڑھی لکیر کے کردار اختر النسا بیگم سے زیادہ فعال ہیں اور اپنا ایک واضح نصب العین اور طاقت رکھتے ہیں۔

۲ سماجی حیثیت:

شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں معاشرہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کسی بھی شخص کے حالات و واقعات اس کی شخصیت پر نمایاں طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی بھی کردار کو سمجھنے کے لیے اس کے حالات و واقعات اور سماجی حیثیت کا معلوم ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ اسی سے اس کی انفرادیت کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر کی تصنیف دو الگ ادوار میں الگ سماجی و معاشرتی صورت حال میں ہوئی۔ اسی لیے دونوں ناولوں کے کردار مختلف عمل اور رد عمل ظاہر کرتے ہیں اور الگ نظریہ حیات لیے ہوئے ہیں۔ اختر النسا بیگم کی تصنیف کے دور کا تعین کیا جائے تو ایک ایسے معاشرے کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جو تعلیم نسواں کے حوالے سے اپنی تمام تر پابندیوں اور رکاوٹوں سے عبارت ہے۔ جہاں لڑکی کو اونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہیں تھی اور اس کا گھر سے نکلنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس صورت میں نذر سجاد حیدر نے تعلیم نسواں کی اہمیت و ضرورت کے تحت یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم یافتہ فرد ہی معاشرتی ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے اور معاشرہ تب تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا جب تک ہم اس کے اہم ستون یعنی عورت کو اتنا اختیار نہیں دیں گے کہ وہ معاشرتی ترقی کا بوجھ اٹھا سکے۔ عورت کی سماجی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عورت کے بغیر معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا لیکن اس دور کے ہندوستان میں اسے یہ حق حاصل نہیں تھا۔ نذر سجاد نے اپنی تحریروں میں عورت کی سماجی حیثیت کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی مثال یوں ملتی ہے:

> ''اگر بہتری قوم منظور ہے۔ تو سب سے پہلے جہاں تک ممکن ہو سکے۔ تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیے کہ ساری قوم سنبھل گئی۔ کیونکہ بے علم معراج ترقی پر پہنچنا ناممکن ہے۔ خواہ آپ کتنا ہی علم حاصل کر لیں۔ کبھی آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ جب تک کہ دنیا میں اپنی سب سے پہلی رہنما عورتوں کو جن کی گود تمام قوم کا ابتدائی سکول ہے۔ چشمہ علم سے سیراب نہ کر سکیں گے۔۔۔''(۳)

اس دور کے ہندوستانی معاشرے میں عورت کی سماجی حیثیت اچھی نا تھی۔اسے ضروریات زندگی تک سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ایسے فیصلے جو اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتے،ان میں بھی اسے آزادی اظہار کی اجازت نہ تھی اسے ایک آبجیکٹ کی طرح برتا جاتا تھا۔اس کی ایک مثال لڑکی کی بنامرضی کے شادی کر دینا ہے۔ یا پھر صغر سنی کی منگنی اور شادی کا طے کر دینا جب بچے کو خود بھی اپنے اچھے برے،اپنی پسند ناپسند کا شعور نہیں ہوتا۔اختر النسا بیگم کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا،اس کی شادی اس کی رضامندی کے بنا اس کی سوتیلی ماں کی مرضی سے ایک ایسے شخص کے ساتھ طے پائی جس سے اس کی کوئی ذہنی ہم آہنگی نہ تھی بل کہ وہ اس کے معیار کا جوڑ بھی نہیں تھا۔اختر ایک پڑھی لکھی سمجھدار اور فہم وفراست والی لڑکی تھی جب اس کے برعکس اس کا شوہر ان پڑھ شخص تھا لیکن یہاں مصنفہ کا مقصود چونکہ تعلیم کی اہمیت کو ابھارنا تھا اس لیے نذر سجاد نے اختر کو اپنی تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر حالات پر قابو پاتے دکھایا ہے۔

اختر النسا بیگم میں اختر کو سماجی طور پر کمزور کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اختر نے اپنی زندگی کو اپنے شوہر اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور اپنے لیے بھی کسی قسم کا کوئی فیصلہ لینے کا اختیار اپنے پاس نہ رکھا اس کی مثال ناول میں یوں ملتی ہے :

> "آہ پیاری مجم کو کیا لکھوں ؟بس کچھ نہیں لکھا جاتا۔اور نہ آئندہ لکھا جاسکے گا۔کیونکہ اب میں اپنے شوہر کی بے اجازت کوئی کام نہ کروں گی۔ گو انھوں نے مجھے اب تک کچھ نہیں کہا۔لیکن آپ سب سے خط و کتابت کرنے کی میں ان سے اجازت نہ مانگوں گی۔کیونکہ جس طرح میری زندگی نے پلٹا کھایا ہے اسی طرح میں بھی اس کے مطابق بسر اوقات کروں گی"(۵)

ناول میں بعض نسائی کردار طاقتور بھی دکھائے گئے ہیں جو اپنی مرضی سے اپنی فیصلے لینے میں خود مختار ہیں اور انھوں نے مردوں کی زندگی بھی اجیرن کر رکھی ہے لیکن انھیں قدیم روایات کی پاسداری کرتے ایسے کرداروں کے طور پر ابھارا گیا ہے جو اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں اور ان کے لیے اپنی ذات سے بڑھ کر کوئی شے بھی اہم نہیں ہے۔

دوسری طرف ٹیڑھی لکیر کے نسائی کرادروں کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے کردار ایسے فعال کرداروں کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں جو مصائب کے باوجود اپنی ذات کو کسی بھی طرح مدغم نہیں ہونے دیتے۔ شمن اس ناول کا زندگی سے بھرپور کردار ہے جو اپنی حیثیت کو منواتی ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔وہ معاشرتی جبر کو قبول نہیں کرتی ہے بل کہ اس سے ٹکرا کر اپنی ذات کا یقین دلاتی ہے۔ عصمت چغتائی کے ہاں عورت کی سماجی حیثیت نسبتاً بہتر نظر آتی ہے۔اس کی ایک وجہ معاشرتی تبدیلیاں بھی ہیں۔نذر سجاد کے ناول سے تقابل کیا جائے تو اس دور میں معاشرہ ہی اس بات کو قبول نہیں کرتا تھا کہ عورت پڑھنے لکھنے کے لیے گھر سے باہر آئے اور اپنے حقوق سے

واقف ہو، لیکن عصمت چغتائی کے دور تک پہنچتے پہنچتے حالات کافی حد تک بدل چکے تھے اور عورت پر مسلط پردہ اور دیگر معاشرتی پابندیاں کسی حد تک کمزور پڑ چکی تھیں۔ اس صورت میں عورت سماجی طور پر بھی مضبوط ہو گئی تھی اور اپنے برے بھلے سے واقف تھی۔ عصمت چغتائی کے ہاں معاشرتی اقدار کی رد تشکیل نظر آتی ہے۔ انھوں نے سماج اور سماجی رویوں پر تنقید کی ہے اور غیر ضروری بندشوں کو توڑنے کی ترغیب دی ہے اس کی مثال ان کے اس جملے میں ملتی ہے: "جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ بھی سکتے ہیں"(۶)

عصمت چغتائی کے نسائی کردار سماجی بندشوں میں الجھنے کی بجائے ان بندشوں کو توڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ شمن کا کردار اس کی اہم مثال ہے۔ محض شمن ہی نہیں بل کہ دوسرے کردار بھی ان جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کے لیے تیار ہیں اور روایتی طریق زندگی سے کسی حد تک اکتائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ٹیڑھی لکیر کے کردار جدت پسند ہیں اور فرسودہ روایات کو اپنی راہ کی رکاوٹ نہیں بننے دیتے۔ اس کی ایک مثال ایلما کا کردار بھی ہے۔ ایلما روایات سے منحرف ہے اور وہ اس میں مذہب تک سے بیگانہ ہے۔ وہ انسان کو تمام تر حدود و قیود سے آزاد ایک جاندار تخلیق سمجھتی ہے اور کوشش بھی یہی کرتی ہے کہ اس کی آزاد دنیا میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ ایلما کے کردار کی وضاحت کے ساتھ معاشرے کی عکاسی شبنم رضوی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "عام طور پر بن بیاہی ماں بننے کا جب خطرہ ہوتا ہے تو لڑکی سماج اور خاندان کے ڈر سے لڑکے سے شادی کرنے کی خواہش کرتی ہے مگر یہاں سیتل بار بار شادی پر زور دے رہا ہے اور ایلما اسے نیچا دکھانے کے لیے اس کے بچے کو گرانے کو تیار ہے۔ یہ کردار نئی اور پرانی روایت کے بیچ کش مکش میں مبتلا دکھائی پڑتا ہے۔ ایک جگہ تو وہ بغیر شادی کے انتظار کے بچے کی ماں بننے کی خواہش مند ہے اور جب یہ خواہش غیر شعوری طور سے سیتل سے پوری ہو جاتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ "جسمانی طور پر تو میں واقعی بہت دن زندہ رہوں گی مگر میری روح مر چکی ہے"(۷)

یہاں عصمت چغتائی نے ایلما کو سماجی طور پر ایک مضبوط کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو معاشرے میں برابری کی طلبگار ہے اور اپنی اہمیت جانتی ہے۔ ان کے ہاں سماجی طور پر مضبوط نسائی کردار دکھائے گئے ہیں۔

۳ فیصلے کا اختیار:

اختر النسا بیگم میں اختر ایک ایسے کردار کے طور پر سامنے آئی ہے جو ابتدا میں اپنا کوئی نظریہ زندگی نہیں رکھتی۔ اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے۔ اختر نے حالات سے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور باوجود اس کے کہ وہ ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہے، اس نے اپنے لیے کسی بھی قسم کا فیصلہ لینے سے گریز کیا۔ اختر کی سوتیلی ماں نے جب اس کے لیے ان پڑھ لڑکے سے شادی کا جال بچھایا تو اس نے ناچاہتے ہوئے بھی فیصلہ اپنے بڑوں پر چھوڑ دیا

بالکل اسی طرح جس طرح اس دور کی عام لڑکیاں اپنی زندگی کا اختیار دوسروں کو دے دیا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد اس کی زبوں حالی جب اپنی انتہا کو پہنچی اور شوہر اور خاندان کے دیگر افراد کی وفات کے بعد جب اسے کوئی اور راستہ سجھائی نہ دیا تو اس نے اپنی ذات کے بارے میں سوچا اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اور اپنی تعلیم کے بل بوتے پر اپنی زندگی گزارنے کے لیے نوکری اختیار کی۔

ناول میں اختر النسا کا کردار ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کرتا ہے جسے اپنے حقوق کا ادراک ہے لیکن اس کے پاس قوت فیصلہ اور اتنا اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی خواہش اور پسند و ناپسند کو عملی جامہ پہنا سکے۔ ایسا بھی نہ تھا کہ اختر کو کوئی ایسا شخص میسر نہ تھا جو اس کی ناپسند کی شادی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکے اور اسے اس مصیبت میں پھنسنے سے بچا سکے۔ لیکن اس نے شادی سے انکار کے موضوع پر کسی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا اور جو اسے کچھ کہتا وہ اسے خاموش کروا دیا کرتی۔ اس کی مثال یوں ملتی ہے:

> "۔۔۔ مس صاحبہ کو اس سے بہت ہمدردی تھی۔ اختر کی شادی ان کو بالکل ناپسند تھی۔ اور بہت سمجھاتی تھیں کہ "تم انکار کر دو"۔ مگر اختر ہندوستانی شرم کی پتلی تھی۔ وہ ان کی اس قسم کی باتیں سن بھی نہ سکتی تھی۔ اور کہہ دیتی تھی کہ "آپ اس باب میں کچھ نہ کہیں جو میرے والدین کو منظور ہے وہ ہو گا" (۸)

اختر النسا نے خود کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور ہندوستانی معاشرے کے کٹر نسطریات سے منحرف ہو کر اپنے والدین سے یہ پوچھنے تک کی جرات نہ کی کہ وہ کن لوگوں کے حوالے کی جا رہی ہے۔ لفظ "حوالے" پر غور کیا جائے تو واقعی اس دور کے ہندوستانی معاشرے میں لڑکی کی شادی محض سودے بازی بن کر رہ گئی تھی۔ جہاں اسے اس کی مرضی پوچھے بغیر ایک مالک سے دوسرے مالک کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں لڑکی کو یہ اختیار بالکل نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ اس معاملے پر اپنی کسی بھی قسم کی رائے کا اظہار کرے۔ اختر النسا بیگم کا کردار اس دور کی ہندوستانی عورت کی تصویر کشی کرتا ہے جو علم و فہم اور شعور ذات کے باوجود اپنے لیے کسی بھی قسم کا فیصلہ لینے کی اہل نہیں۔ اور افسوس کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں۔ اس کی ایک مثال ان سطور میں ملتی ہے:

> "۔۔۔ افسوس مجھے اتنا بھی نہیں معلوم۔ کہ میں آج سے جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں۔ وہ لوگ کون ہیں۔ کہاں کے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہوگی۔ اس کی عادت، مزاج، اخلاق، تعلیم، عمر، خیالات، نام تک بھی تو مجھے معلوم نہیں۔ مجھے بیگم پر کچھ افسوس نہیں وہ سوتیلی ماں ہے۔ میرے ساتھ جو بھی کرے بجا ہے۔ ہائے افسوس تو پیارے ابا جان پر ہے۔ انھوں نے مجھ پر ذرا رحم نہ کیا۔ اور غیروں کی خوشی پر مجھے قربان کر دیا" (۹)

ٹیڑھی لکیر میں عورت کی سماجی حیثیت نسبتاً بہتر دکھائی گئی ہے۔ عصمت چغتائی کے نسائی کردار مضبوط اور فیصلے کا اختیار رکھتے ہیں اور سماجی طور پر مضبوط ہیں۔ان میں شمن کا کردار سرفہرست ہے جو سماجی اقدار کو تحس نحس کر دینے کا جذبہ رکھتی ہے اور اپنے لیے اپنی من مانی ڈگر اختیار کرتی ہے۔ شمن قدیم ہندوستانی عورت سے قدرے مختلف ایک متحرک اور مضبوط کردار ہے۔ قدیم ہندوستانی معاشرے میں لڑکے تک کو اپنی شادی کے حوالے سے پسند کا اظہار کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن عصمت چغتائی کے ہاں شمن کی صورت میں ایک باغی عورت کے طور پر ابھرتی ہے، جو نا صرف پسند کی شادی کرتی ہے بل کہ ذات پات، رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر آئرش نوجوان سے شادی کر لیتی ہے ایسا کرنے سے وہ گویا پورے سماجی ڈھانچے کو متزلزل کر کے رکھ دیتی ہے۔ جو صدیوں سے اپنے اندر پیدا ہونے والی کسی بھی تبدیلی کو قبول کرنے سے گریزاں تھا۔ اور پھر سماجی دباؤ کے باوجود اس شادی کو کامیاب بنانے کی کوشش میں زندگی برباد نہیں کرتی۔ تاہم یہاں بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ جس نکتہ نظر کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔ وہ اس کے شوہر کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا۔ چنانچہ نتیجہ دائمی جدائی کی صورت میں ابھرتا ہے۔

اسی طرح ایک کردار ایلما کا بھی پیش کیا گیا ہے جو بنا شادی کے ماں بننے کے باوجود اس شخص سے رشتہ ازدواج میں محض اس لیے بندھنا نہیں چاہتی کہ لوگ کیا کہیں گے ؟ اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہیں گے بل وہ اپنی مرضی کے مطابق اکیلی بچے کو جنم دے کر اسے اپنا لیتی ہے۔ وہ روایتی ماؤں کی طرح اس ناجائز اولاد کو قبول کرنے سے بھی قاصر ہے جس نے اس کی جسم کی بھوک کو مٹا کر روح کی پیاس بڑھا دی۔ یہاں اس تصور سے بھی انحراف کیا گیا ہے کہ بچے عورت کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ ایلما نے اپنے بچے کو اپنے پاؤں کی زنجیر تو نہ بننے دیا لیکن اسے ساتھ ساتھ لیے ضرور پھری۔ جس سے اس کے ممتا کے جذبے کی تسکین محسوس ہوتی ہے۔

۴۔ معاشرے کی عکاسی:

موضوع کے حوالے سے دیکھا جائے تو دونوں ناول ہندوستانی معاشرے کی صورتحال بیان

کرتے ہیں بنیادی موضوع ہندوستانی معاشرہ ہی ہے۔ ثانوی طور پر دیکھا جائے تو اپنے عہد اور حالات کے حوالے سے کہیں نہ کہیں کوئی تفریق پائی جاتی ہے۔ اختر النسا بیگم ایک محدود حد تک ہندوستانی خواتین کی تصویر کشی کرتا نظر آتا ہے۔ اختر النسا بیگم کی اشاعت ۱۹۱۰ میں ہوئی اور ٹیڑھی لکیر ۱۹۴۴ میں منظر عام پر آیا۔ دونوں ناولوں کی تصنیف میں تین دہائیوں کا وقفہ پایا جاتا ہے۔ اختر النسا بیگم کی تصنیف کے دور میں ناول اپنی ارتقائی منازل طے کر رہا تھا اور عصمت چغتائی کے دور میں پہنچتے تک ترقی یافتہ دور میں داخل ہو چکا تھا۔ اس حوالے سے معاشرتی معاملات و مسائل بھی مختلف نوعیت کے ہو گئے تھے۔ پہلے دور میں عورت کے لیے حصول تعلیم ناممکنات میں سے

تھا۔ جب کہ بعدازاں فروغ تعلیم نسواں کی تحریکوں سے خواتین کے لیے بھی تعلیم و ترقی کی راہیں ہموار ہو چکی تھیں تو ادب میں عورت کی تصویر کشی بھی مختلف انداز میں کی گئی۔ اختر النسا بیگم میں ہندوستانی معاشرے اور خاص کر عورت کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں اس کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نظریے کی تشکیل کی گئی ہے اس دور میں متعدد مصنفین نے تعلیم نسواں کے حوالے سے تحریریں لکھیں۔

جن کا مقصد خواتین کو تعلیمی زیور سے آراستہ کرنا تھا اس حوالے سے علی عباس حسینی یوں رقم طراز ہیں:

"اس اصلاحی دور میں۔۔۔کچھ پڑھی لکھی عورتوں نے چھوٹے قصے اور ناول بھی لکھے۔ان کا مقصد لڑکیوں کو صحیح تعلیم دینا تھا اور انتظام خانہ داری بتانا تھا۔ان کی غرض حسن و عشق کی کہانی سنانا نہ تھی اور نہ جنسیات، اقتصادیات وسیاسیات کے مسائل سے بحث ان کا مقصد تھا۔۔۔"(۱۰)

یہی صورت اختر النسا بیگم میں بھی ملتی ہے۔ ناول میں نظریہ تعلیم کی حمایت میں پلاٹ کی تشکیل کی گئی ہے اور تمام حالات و واقعات اسی رجحان کی حمایت میں ترتیب دیے گئے ہیں تا کہ ہندوستانی معاشرے میں تعلیمی رجحان اور خاص طور پر تعلیم نسواں کا رجحان پروان چڑھ سکے۔ ناول میں اختر النسا کا کردار اسی نظریے کے فروغ کے لیے تمام تر مصائب کا سامنا خاموشی اور تحمل سے کرنے پر مجبور ہے تا کہ علم کی اہمیت واضح ہو سکے کہ وہ کس طرح فرد میں تحمل پیدا کرتی ہے اور اسے معاشرے کا پر سکون فرد بناتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر کی تصنیف کے دور تک حالات کافی سازگار تھے اور عورت کو کھل کر اظہار ذات کرنے کی اجازت تھی۔ اور ناول میں دیگر فنی اور تکنیکی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں تھیں۔ اس لیے عصمت چغتائی نے ایسے کردار پیش کیے جو جدید زندگی کے بعض معاملات میں الجھے ہوئے ہیں، جنھیں بظاہر تو کوئی الجھن نہیں ہے لیکن اندر ہی اندر ایک جہد مسلسل جاری ہے اور نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول میں فرد کو بطور خاص موضوع بنایا ہے جس میں اس کی نفسیاتی کشمکش اور اس کے شخصی رویوں کا ذکر کیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حمیرا اسعید یوں رقمطراز ہیں:

"عصمت نے ناول میں فرد کو اس کی سماجی نفسیات کے ساتھ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح فرد کی شخصیت اپنے ماحول کے حساب سے بنتی اور بگڑتی ہے"(۱۱)

اسی طرح ایک لڑکی سے عورت تک کے سفر اور اس کی ذہنی الجھنوں اور اسے پیش آنے والے معاملات کو بیان کیا گیا ہے یہاں عصمت چغتائی نے جنسی رویوں اور کیفیات کا اظہار بھی بے باکی کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے لڑکیوں کو درپیش مسائل کا باریکی سے مطالعہ کیا ہے اور ان مسائل کا ان کی نفسیات پر اثرات کا بیان بھی مدلل انداز میں

کیا ہے گویا یہاں وہ ماہر نفسیات کی طرح نوجوان لڑکیوں کو درپیش مسائل کا جائزہ لیتی نظر آتی ہیں۔اس حوالے سے حمیرا سعید یوں رقمطراز ہیں:

ٹیڑھی لکیر ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جس کو عصمت نے اس کے بچپن اور جوانی کی نفسیات، جنسی خواہشات اور ذہنی کشمکش کے ساتھ پیش کیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار شمشاد بیگم عرف شمن کا ہے جس کی شخصیت اپنے والدین کی بے توجہی سے بگڑتی جاتی ہے اور اس کا کردار ٹیڑھی لکیر ہو جاتا ہے"(۱۲)

یہاں ایک اہم موضوع والدین کی عدم توجہی کا بیان کیا گیا ہے جس میں ایک اشارہ مرد کی بالادستی اور عورت کی کم مائگی کی طرف بھی کیا گیا ہے۔ناول میں والدین کی عدم توجہی کی وجہ سے بچوں کی نفسیاتی بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے اور انھیں خاطر خواہ توجہ نہ ملنے پر جو رد عمل ان کی شخصیت کی خرابی کے طور پر ابھرتا ہے اسے خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔عصمت چغتائی نے جنسی مسائل کی وجہ مناسب تربیت نہ ہونے کو قرار دیا ہے۔

"اور یہ سب ابا کا قصور تھا، کیا مجال جو اماں دودھ پلا جائیں، ادھر بچہ پیدا ہوا، ادھر آگرے سے گولن منگوائی ۔دودھ پلوائے اور بیگم کی پٹی سے پٹی جڑی رہے۔پھر بھلا بچے کیوں سانس لیتے؟ گھر کیا تھا، جیسے گائے بیلوں کا باڑا ، کھانا ہے تو پتیلوں، پینا ہے تو گھڑوں، سونا ہے تو گھر کا کونا کونا زندگی سے لبریز، چھلکنے کو تیار!۔۔۔۔"(۱۳)

دونوں ناولوں کے موضوعات پر بات کی جائے تو دونوں میں افراد کے معاملات و مسائل کو بیان کیا گیا ہے اختر النسا بیگم میں محض خارجی معاملات و مسائل کا بیان ملتا ہے جب کہ ٹیڑھی لکیر خارجی معاملات و مسائل کے انسانی ذہن پر اثرات کو بیان کرتا ہے یعنی اس میں فرد کے خارجی عوامل کے اس کے داخلی احساسات و جذبات پر بات کی گئی ہے۔اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنیں بھی ناول کا موضوع بنائی گئی ہیں۔جب کہ اختر النسا بیگم میں محض واقعات کا بیان ملتا ہے۔اور کرداروں کی خارجی الجھنیں معلوم ہوتی ہیں۔

عصمت چغتائی نے اس دور کے ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی اس خوبی سے کی ہے کہ اس دور کے مروجہ رسوم و رواج اور معاشرتی تنگ نظری کھل کر سامنے آتی ہے۔اس دور میں عورت کی محکومی اور معاشرتی جبر کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔اس ضمن میں بیوہ کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اور اس پر زندگی کے تمام دروازے بند کر کے محض بیوگی کی چادر اوڑھ کر زندگی کے دن تمام کرنا، اس سماج کی عکاسی کرتا ہے جو مذہب تک سے منحرف ہے اور مذہبی طور پر عورت کو دیے گئے حقوق سے بھی کوتاہ ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے عصمت یوں رقمطراز ہیں:

"۔۔۔زندگی کا سہارا ہی کیا تھا سوائے آہوں اور سسکیوں کے، یہ عمر اور رنڈاپا؟۔۔۔چوڑیاں اور رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تو یہ سب لوگوں پر احسان نہیں تھا تو کیا تھا۔رنڈاپے میں زندگی کے دن گزار کر وہ مرے ہوئے

میاں کے ساتھ جیتے جاگتے، ساس سسر اور ماں باپ کا بھی تو سوگ کر رہی تھی، جب کوئی تہوار آتا تو وہ اپنا ناٹک شروع کر دیتی۔ ایک کونے میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور بین شروع کر دیتی۔ جلدی سے گھلی ہوئی مہندی پھنکوا دی جاتی۔ چوڑی والی کو ہش ہش کر کے ٹال دیا جاتا۔ سویوں کا زردہ پکنا ملتوی ہو جاتا۔۔۔"(۱۴)

عصمت چغتائی نے معاشرتی اصول و ضوابط پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔ اور بیوہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک اور اس پر زندگی کی رنگینیوں کے در بند کر دینے کے مسئلے کو بطور خاص پیش کیا ہے۔ انھوں نے معاشرتی قیود کے ساتھ ساتھ فرد کی ذات پر زیادہ توجہ دی ہے اور فرد پر ان حالات کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بڑی آپا کا کردار پیش کیا ہے جو ان بے جا پابندیوں کی وجہ سے برائی کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی رغبت ان چیزوں کی طرف ہو جاتی ہے جو اسلام میں منع ہیں۔ اس کی وجہ بھی اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنا بتایا گیا ہے۔

عصمت چغتائی نے سماجی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے رنگ و نسل کے تعصب کی عکاسی بھی کی ہے۔ ہندوستانی عوام ابھی بھی رنگ و نسل کے تعاصب سے باہر نہیں نکل سکی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انگریز کو گورے رنگ کے فرق کی وجہ سے امتیازی درجہ دیا گیا تھا، یعنی کالا حقیر اور گورا برتر مانا جاتا تھا۔ عصمت چغتائی نے فرد کے ظاہر سے زیادہ اس کے باطن اور اس کی شخصیت کو اہمیت دی ہے اور اس کے ان خصائص کو فوقیت دی ہے جن کی بنیاد پر اسے امتیاز دیا جا سکتا ہے۔ اس میں محض ظاہری فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

"اگر ابھی اس کی جگہ کوئی سفید قوم کی لڑکی ہوتی تو سر بازار اپنے سیاہ بھٹ میاں کو چٹاچٹ چومنے کا حق رکھتی تھی۔ بل کہ فخریہ کہتی تھی کہ لو دیکھو میرے روپہلی حسن کی طاقتیں، کہاں کہاں کا جانور پھانس کر لاتی ہیں۔ اور وہ سیاہ آدمی بھی اس روپہلی بارش سے کھل کر فخریہ کہتا کہ "دیکھو تم ہم کو کالا سمجھتے ہو مگر یاد نہیں کرشن جی بھی تو کالے تھے اور گوپیاں ان کی متوالی تھیں۔۔۔" مگر وہ، حقیر تھی"(۱۵)

درج بالا سطور میں محض رنگ و نسل کا تعصب ہی نہیں ابھرتا بل کہ مرد کی عورت پر بالادستی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے عصمت چغتائی نے شمن کے ساتھ شادی کے بعد پیش آنے والے مسائل کا احاطہ کیا ہے اور ہندوستانی معاشرے کی تنگ نظری پر تنقید بھی کی ہے کہ وہ کس طرح رسوم و رواج اور تعصبات میں الجھ کر دوسرے شخص کے لیے زندگی کا حلقہ تنگ کر دیتے ہیں۔ اور بے بنیاد مسائل میں الجھ کر اپنے وقت کے زیاں کا باعث بنتے ہیں۔ شمن اور ٹیلر کو شادی کے بعد جن مسائل کا سامنا کرنا وہ دونوں اس کے لیے پہلے سے تیار تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاملات سنگین ہوتے چلے گئے اور شمن لوگوں کی ناگوار نظروں کا سامنا نہ کر پائی یوں دونوں کی ذاتی زندگی متاثر ہو گئی۔

"اسٹیشن پر ایک دوسرے سے رشتہ داری ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔اور کمپارٹمنٹ میں بھی اگر کوئی غور سے دیکھتا تو دونوں کو انسانیت سے زیادہ قریب رشتے میں منسلک تصور نہ کرتا۔وہ ایک دوسرے سے بے توجہ اپنی تنہائی ظاہر کرنے میں کوشاں تھے۔کوئی نہ دیکھتا ہو تا جب بھی حساس بنے غصے ہونے کو تیار رہتے۔آوازوں پر کان لگائے رہتے کہ کہیں ان کے ہی متعلق کانا پھوسی نہیں ہو رہی ہے غیروں کی طرح ڈائننگ کار میں کھانا کھایا۔بل ادا کرتے وقت ٹیلر کے کان سرخ ہو گئے اور شمن نے بیرے کی ناقدانہ نظروں کا بڑی مشکل سے مقابلہ کیا۔دو بے جوڑ انسان اپنے جوڑ کے بے تکے پن کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔(۱۶)

دونوں مصنفین نے ایسی عورت کا تصور پیش کیا ہے جو معاشرے کا ایک ایسا فرد ہے جس پر کئی طرح کی پابندیاں عائد ہیں۔کہیں وہ تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے تو کہیں ازدواجی زندگی کی خوشحالی کے لیے معاشرے کے اصولوں سے بغاوت کا راستہ اختیار کرتی ہے۔دونوں ناولوں کے نسائی کردار اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے معاشرے کی جکڑ بندیوں سے فرار کی راہ اپناتے ہیں۔کہیں وہ اس کے تمام مظالم کو برداشت کرتے ہوئے صبر سے ان کا مقابلہ کر کے اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوتے ہیں تو کہیں وہ ان بے جا پابندیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ان سے بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ناول میں ذیلی کرداروں میں ایسے نسائی کردار بھی ملتے ہیں جو معاشرتی دباؤ میں محض بچے جننے اور بیوگی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں لیکن ان کی ذمہ داری ان کرداروں پر بھی آتی ہے جو اپنی حالت کو بدلنے کی خود سے کوئی کوشش نہیں کرتے۔اس میں عورت کے لیے ایک تحریک بھی ہے کہ وہ خود اپنے مسائل پر قابو پانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے۔جیسا کہ اختر کے کردار سے واضح ہوتا ہے۔جب تک اس نے خود اپنے لیے حالات کو سازگار بنانے کی کوشش نہ کی حالات اس کے موافق نہیں ہوئے اس میں جستجو اور تڑپ کا ہونا بڑا ضروری امر ہے۔

ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت زیادہ مضبوط نہیں دکھائی گئی۔انھیں کہیں نہ کہیں معاشرتی دباؤ سہنا پڑتا ہے لیکن اپنی حکمت عملی سے وہ اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔اختر کو بھی معاشرتی دباؤ کی وجہ سے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔یہاں تک کہ بیوگی کے دن بھی تنہا کاٹنے پڑے لیکن اس نے حکمت عملی سے مزید تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور معاشی معاملات میں بھی خود مختار ہو گئی۔یہی صورت شمن کی ہے وہ یوں تو ابتدا سے ہی باغی کردار کے طور پر سامنے آئی لیکن پھر بھی معاشرے میں اسے وہ خاص مقام نہ مل سکا جس کی حقدار وہ ایک فرد ہونے کی حیثیت سے تھی۔معاشرے کے معزز افراد نے بھی اسے کبھی ایک عورت سے اوپر کچھ نہ سمجھا۔ان کے لیے اس کے وجود کی قیمت اس کے شعور سے زیادہ تھی۔دونوں کردار چونکہ پدرسری معاشرے میں موجود زندگی کے سفر پر گامزن ہیں اسی لیے انھیں پدرسری نظام کی تمام تر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔

فیصلے کے اختیار کے حوالے سے دونوں کردار مختلف صورتوں میں خود مختار ہیں لیکن اختر زیادہ تر معاشرے کے تابع نظر آتی ہے۔اس کے لیے اپنی مرضی کے خلاف شادی کرنا بھی ایک مجبوری تھی۔ وہ اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے میں بھی خود مختار نہیں تھی۔ لیکن بعد ازاں شوہر کی وفات کے بعد اس نے اپنی زندگی کے تمام فیصلوں کے اختیارات معاشرے کے معزز افراد سے واپس لے لیے تاکہ اپنی زندگی بہتر بنا سکے۔ جب کہ شمن ایک خود مختار کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے جو اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے فیصلے میں خود مختار ہے۔اور اس نے زندگی کے ہر مرحلے پر خود اپنے فیصلے لیے۔

دونوں ناولوں میں ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے اور اسی سے متعلق معاملات و مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔اور اس معاشرے میں رہتے ہوئے نسائی کرداروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناولوں میں مصنفین نے اس دور کے سماجی، معاشرتی اور دیگر مسائل کی عکاسی بھی بخوبی کی ہے۔ دونوں ناول اردو ناول کی تاریخ میں اہم باب ہیں۔ جس سے اردو ادب میں نسائی کرداروں کی ارتقائی صورت سمجھنے میں معاونت ملتی ہے۔

حوالہ جات

۱ قرۃ العین حیدر، بحوالہ، اردو ناولوں میں نسائی حسیت از حمیرہ سعید،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹)، ص ٦٦

۲ ٹیڑھی لکیر، ص ۲۳٦، ۲۳۵

۳ ڈاکٹر عبد القلیل کشش، ناول نگاری کے ارتقا میں خواتین کا حصہ، روزنامہ سیاست: حیدر آباد، ۲۵ اپریل ۲۰۱۵، urdu.siasat.com/news/750581/ناول نگاری کے ارتقا میں خواتین کا حصہ 15.10.2017,11:15am.sunday.

۴ اختر النسا بیگم، ص ۲۴٦

۵ ایضاً، ص ۱۲۸

٦ ٹیڑھی لکیر، ص ۲۴۲

۷ شبنم رضوی، عصمت چغتائی کی ناول نگاری: ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں،(دہلی: نیو پبلک پریس، ۱۹۹۲)، ص ۱۳۴

۸ اختر النسا بیگم، ص ۱۰٦

۹ ایضاً، ص ۱۰۴

۱۰ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید،(علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،)، ص ۳۴۲

۱۱ ڈاکٹر حمیرا سعید، اردو ناول میں نسائی حسیت، ص ۱۱۱

۱۲ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۳ ٹیڑھی لکیر، ص ۱۰

۱۴ ایضاً، ص ۵۰

۱۵ ایضاً، ص ۴۳۹

۱٦ ایضاً، ص ۴۳۸

ماحصل

ماحصل

زیر تحقیق مقالے میں دوناولوں اختر النسا بیگم اورٹیڑھی لکیر کے نسائی کرداروں کاارتقادیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اردوناول کی روایت سے ان دوناولوں کے انتخاب کی وجہ دونوں ناولوں کااپنے اپنے دور کی بھرپور نمائندگی کرنا ہے۔ناولوں کی تصنیف کے وقت ہندوستانی معاشرہ تہذیبی تنوع اور بہت سے تبدیلیوں سے ہمکنار تھا۔اوران رجحانات کی عکاسی ناول نگاروں کی تحریروں میں بھی کی گئی۔زیر نظر تحقیق میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نذر سجاد حیدر اور عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں میں اس دور سے مماثل کردار پیش کیے ہیں یااس سے منحرف ؟

زیر نظر تحقیق میں یہ سوالات اٹھانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ دونوں ناول نگاروں کے ہاں کیا تصور عورت پایاجاتاہے؟مجوزہ دونوں ناولوں کے متن کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات بطور خاص سامنے آتی ہے کہ دونوں ناول نگاروں نے نسوانی کرداروں کوان کے نسائی شعور کے ساتھ بہترین انداز میں پیش کیاہے۔نذر سجاد حیدر کے ناول کامرکزی کردار اختر النسا بیگم کا مرکزی کردار اردوادب کے اس دور کی عکاسی کرتا ہے جب عورت کے لیے زندگی کاسفر اتنا آسان نہیں تھا۔مرد تو در کنار عورت ہی عورت کے حقوق پر قابض تھی اوراس کے لیے مشکلات پیدا کررہی تھی۔اختر النسا بیگم میں ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کی گئی ہے جوپڑھی لکھی ہونے اور فہم وفراست رکھنے کے باوجود حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہے۔جس دور میں یہ ناول تصنیف کیاگیاوہ دور عورت کی تعلیم کے حوالے سے سازگار نہ تھا۔خواتین کے لیے کسی بھی قسم کے تعلیمی اوراصلاحی مراکز موجود نہ تھے حتیٰ کہ ان کاگھروں سے نکلنا تک معیوب سمجھا جاتا تھا۔لیکن نذر سجاد نے وقتی تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اس امر پر خصوصی توجہ دی ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کے مقابل سہولیات زندگی دی جائیں اوران کے بنیادی حق تعلیم سے انھیں محروم نہ رکھا جائے۔اس ناول کی تصنیف میں بھی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نظریہ تشکیل دیاگیا ہے کہ پڑھی لکھی عورت ہی معاشرے کے فعال رکن کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرسکتی ہے۔اختر النسا بیگم میں ایک پڑھی لکھی عورت کو معاشرے کے متحرک اور سرگرم رکن کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔جس میں حالات وواقعات پر اس کے رد عمل اوراپنی فہم وفراست سے ناموافق حالات کو بہتر بنانے کی کوششیں سرفہرست ہیں۔ناول میں اختر ایک کمزور کردار کے طور پر پیش کی گئی ہے جوبظاہر تو معاشرتی ظلم اور جبر کے آگے بے بس نظر آتی ہے لیکن در حقیقت اس

کی عالی حوصلگی اور ناقابلِ شکست ارادی قوت اسے نامناسب حالات میں بھی آگے بڑھنے سے نہیں روک سکی۔ اس ناول میں پڑھی لکھی عورت کو حالات کی بہتری کا ضامن قرار دیا گیا ہے۔ کہ اگر عورت پڑھ لکھ جائے گی تو اپنی فہم و فراست سے مشکل سے مشکل صورتحال پر بھی قابو پا لیتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف اختر کی سوتیلی ماں کی صورت میں ایسی عورت کا تصور پیش کیا گیا ہے جو بظاہر تو صاحب اقتدار ہے اور اپنی اور اپنی بیٹی کے لیے ہر قسم کا فیصلہ لینے کا اختیار رکھتی ہے۔ لیکن وہ کم علمی کی وجہ سے دوسروں کے لیے اذیت اور مشکل کا سبب بنتی ہے۔

ناول میں اختر النسا کو ایک باشعور کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی معاشرے کی فرسودگی اور معاشرتی جکڑبندیوں کے حصار میں ہے۔ والدین کی عزت و تکریم اسے اپنے لیے کسی بھی قسم کا فیصلہ لینے سے باز رکھتی ہے۔ اور کہیں عورت ذات پر اٹھنے والے سوالیہ نشان اسے اپنے حق سے دستبردار ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی لیے بیوگی میں گھر والوں کے ناروا سلوک سے تنگ آ کر اختر نے مزید تعلیم کے حصول کو ممکن بنایا اور اپنی اقتصادی ضروریات کے پیش نظر اس دور میں بھی ملازمت کی جب عورت گھر سے نہیں نکل سکتی تھی۔ ملازمت کے پیش نظر اختر نے اپنا حلیہ اور مذہب تک تبدیل کرنے میں تامل نہ کیا۔ اور پارسی لیڈی کے روپ میں یہ تمام سرگرمیاں سرانجام دیں کیوں کہ مسلمان عورت کے لیے یہ تمام امور سر انجام دینا مناسب نہ تھے۔ یہاں تعلیم کی اہمیت اور ناموافق حالات میں اس کے ثمرات کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورت اگر تعلیم یافتہ ہو گی تو مشکل وقت میں کسی کی محتاج نہیں ہو گی۔ نذر سجاد حیدر نے نسائی کرداروں کی سماجی حالت کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ اور ان کا جائزہ سماجی و معاشرتی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے لیا گیا ہے۔ اسی طرح نذر سجاد حیدر نے پدر سری معاشرے سے انحراف کیا ہے لیکن انحراف کے باوجود وہ کہیں نہ کہیں ان رسوم و رواج کے آگے مجبور اور بے بس نظر آتی ہے۔ اختر النسا ایک ایسے کردار کے طور پر سامنے آئی ہے جو ان رسوم سے فرار تو چاہتی ہے لیکن وہ اس کا برملا اظہار نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ اس صورتحال سے فرار حاصل کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتی ہے اور پارسی لیڈی کے روپ میں اپنے متعینہ مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر کی تصنیف اس دور میں ہوئی جب ماحول عورتوں کی تعلیم و ترقی کے لیے سازگار تھا۔ اس لیے اس کے نسائی کردار متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔ ٹیڑھی لکیر میں نسائی کردار ایک مکمل شکل میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور اپنا ایک واضح نصب العین رکھتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے شمن کے کردار کی صورت میں ایک ایسے متحرک کردار کی پیشکش کی ہے جو ان سے پہلے اردو ناول میں موجود نہیں تھا۔ ان کے نسائی کردار اپنا واضح نصب العین رکھنے کے ساتھ ساتھ اتنی قابلیت کے حامل بھی ہیں کہ ایک واضح نصب العین کے مطابق اپنی زندگی بسر کر

سکیں۔ شمن کے حوالے سے دیکھا جائے تو شمن نے قدیم ہندوستانی تصور عورت کے موافق اپنی زندگی کو اپنے نصب العین کے تحت گزارا۔ جس میں اس نے اپنے خاندان اور معاشرے کو کسی بھی قسم کی دخل اندازی کی اجازت نہیں دی۔ شمن ایک متحرک نسائی کردار ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فیصلوں میں خود مختار بھی ہے۔ اور رسوم ورواج سے انحراف کر کے ایسے نوجوان سے شادی کر لیتی ہے جو نہ تو اس کا ہم مذہب ہے اور نہ ہی ہم نصب۔ قدیم ہندوستانی معاشرے کے تناظر میں اگر اس انتہائی قدم کو دیکھا جائے تو روایت شکنی کی جرات مندانہ مثال سامنے آتی ہے۔ ایسی روایت جہاں محض عورت ہی نہیں مرد بھی معاشرے کی فرسودہ روایات کے آگے مجبورِ محض ہے۔ اس صورتحال میں ایک عورت خود اپنی شادی کا فیصلہ لینا کوئی عام بات نہیں۔ شمن کی صورت میں اردو ناول کا ایک ایسا کردار سامنے آتا ہے جو مسلسل ارتقا پذیر ہے۔

اسی ناول میں ایک کردار ایلما کا بھی پیش کیا گیا ہے۔ جو رسوم ورواج سے منحرف اپنی من مانی کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ ایلما ہندوستانی روایتی تصور عورت سے ہٹ کر ایک ایسی عورت کے طور پر ابھری ہے جو مامتا کے روایتی جذبات سے عاری ہے۔ یہ ایک ایسی عورت ہے جو کھلی ہوا میں سانس لینے کی خواہاں ہے۔ اسے روایتی معاشرت کی آلودہ ہوائیں گھٹن کا شکار کر دیتی ہیں۔ ایلما کا بنا شادی کے بچہ پیدا کرنا اور اس کے باوجود اپنی بات پر ڈٹے رہ کر ستیل کو شادی سے انکار کر دینا عام تصور عورت سے ہٹ کر ایک بڑی بات تھی۔ عام عورت تو اس عمل کو گناہ تصور کر کے اس گناہ سے بچنے کے لیے اس شخص سے شادی کر لینے کو ترجیح دیتی ہے جس سے اس کے ہاں ناجائز بچے نے جنم لیا ہو ہو تاکہ بد کرداری کے داغ سے اس کا دامن آلودہ نہ ہونے پائے لیکن ایلما کو سماج سے زیادہ اپنی روح کی فکر تھی جسے وہ ایسے شخص سے شادی کر کے تکلیف میں مبتلا نہیں کر سکتی تھی، جس سے اس کی ذہنی ہم آہنگی نہ ہو۔ ٹیڑھی لکیر میں نسائی کردار باشعور کرداروں کے طور پر ابھرے ہیں۔

عصمت چغتائی کے نسائی کردار اپنے دور کے نسائی کرداروں سے مختلف دکھائے گئے ہیں جنھیں محض ایک کردار نہیں بل کہ ایک ایسے انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اپنی نفسیاتی اور جسمانی خواہشات کا اظہار بھی برملا کر دیتا ہے اور اس کے لیے کسی قسم کی رکاوٹ کو برداشت نہیں کرتا۔ ان کے نسائی کردار واضح نصب العین لیے ابھرتے ہیں اور عورت کو بھی معاشرے کا کار آمد فرد کہلوانے کا حق رکھتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے نسائی کرداروں کی پیشکش کے لیے معاشرتی معاملات و مسائل کی عکاسی بھی کی ہے اور عورت کو ہندوستانی معاشرے کے تناظر میں رکھ کر اس کے تمام معاملات و مسائل سے بحث کی ہے اور ان رسوم و رواج کے پیش نظر ہی اس کی سماجی حالت کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ عصمت چغتائی نے پدر سری معاشرے سے

انحراف کی راہ اپناتے ہوئے ایسے کردار پیش کیے ہیں جو اپنا واضح نصب العین رکھتے ہیں اور اپنی خواہشات کے حصول کے لیے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھالینے کی طاقت رکھتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو دونوں ناولوں کی تصنیف دو مختلف ادوار میں ہوئی ہے۔ سیاسی و سماجی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ادوار تیزی سے وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے عبارت ہیں۔ چنانچہ ان تبدیلیوں کے اثرات واضح طور سے انسانی قلوب واذہان پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ابتدا میں جہاں عورت کے لیے تعلیمی سہولیات بھی موجود نہ تھی اس کا لکھنا پڑھنا تو درکنار کسی بھی تحریر کا ان کی نظروں سے گزرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہاں اس کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ایک مشکل عمل تھا اور ایسی صورت میں کسی عورت کا اظہار ذات کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اردو کے بیشتر مصنفین نے خواتین کی تعلیم وترقی کے لیے کوششیں کیں اور اس کے نتیجے میں ان کے لیے تعلیم وآگہی کے راستے ہموار ہونا شروع ہوگئے۔ یہ رجحان ہر دور کے ساتھ ساتھ بدلتا چلا گیا ادب میں بھی اس کی صورتیں بدلتی چلی گئیں ابتدائی دور کے ادب میں جو نسائی کردار ملتے ہیں وہ بعد میں پیش کیے جانے والے کرداروں سے یکسر مختلف اور ارتقا پذیر ہیں، یہی اس تحقیق کا حاصل ہے۔ زیر نظر تحقیق کے لیے یہ مفروضہ پیش کیا گیا تھا کہ اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر کے کردار ایک دوسرے سے مختلف ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی صورت دیگر ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم کے نسائی کردار کا موازنہ اگر اس دور کے دیگر نسائی کرداروں سے کیا جائے تو وہ اس دور کے نسائی کرداروں سے قدرے ممتاز دکھائی دیتے ہیں، جو تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی ضروریات کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے۔ بل کہ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرتی ہے لیکن اس زمانے کے مطابق اسے بہت سے مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جس میں بنا مرضی کی شادی، سسرال والوں کے ظلم وستم، مادی مشکلات، اقتصادی مسائل اور گھر کے افراد کا ناروا سلوک شامل ہیں۔ ان میں سب سے بڑی مشکل سماجی حد بندیوں کے تابع ہونا تھا۔ اختر نے ان سب مشکلات کو سہنے کے بعد اپنے لیے خود فیصلہ لیا اور تعلیم اور نوکری کے لیے گھر سے قدم نکالا جو اس دور کے تناظر میں عورت کے حوالے سے ایک انتہائی قدم تھا۔ لیکن اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ عورت بھی سماج کا ہی ایک حصہ ہے۔ جسے یوں سماجی حد بندیوں اور معاشرتی جکڑ بندیوں میں مقید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔

اس کے برعکس ٹیڑھی لکیر کے نسائی کردار بالکل مختلف صورتحال سے دوچار ہیں۔ یہاں تعلیم کو عورت کا حق سمجھ کر اسے اس حق سے دور نہیں رکھا جا رہا بل کہ اسے محدود سماجی دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں دکھایا گیا ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں عصمت چغتائی نے عورت کے نفسیاتی اور جنسی مسائل

کو بطور خاص پیش کیا ہے۔اردو ناول میں یہ ان کا ہی خاصہ ہے کہ انھوں نے عورت کے جنسی مسائل کا برملا اظہار اپنی تحریروں میں کیا۔ جس پر اظہار خیال کی جرات اس سے پہلے کسی ناول نگار نے نہیں کی۔دونوں ناولوں میں نسائی کردار اپنی ارتقائی صورت میں نظر آتے ہیں جو اس سے پہلے کے ناولوں میں نہیں ملتے۔یعنی دونوں مصنفین نے ایسی عورت کا تصور دیا ہے جو اپنی زندگی کے لیے تغیر کو پسند کرتی ہے۔

دونوں ناولوں میں سماجی و معاشرتی صورتحال کو مد نظر رکھتے ہوئے نظریے کی پیشکش کی گئی ہے اور تصور عورت کی تشکیل بھی اسی معاشرتی اور سماجی دائرہ کار میں رہتے ہوئے کی گئی۔دونوں ناولوں میں ایک طاقتور عورت کا تصور ملتا ہے جو اپنے معاملات و مسائل کے آگے ہار نہیں مانتی بل کہ صورتحال پر اپنی فہم وفراست سے قابو پالینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔اسی طرح دونوں ناولوں میں پدر سری معاشرے کی تردید کی گئی ہے اور سماجی و سماجی جکڑ بندیوں سے آزادی اور انحرف کی راہ اپنائی گئی ہے۔

ال مختصر دونوں ناولوں کا تجزیہ کرنے سے یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ عورت چاہے جس دور میں بھی ہو اسے معاشرے کی تلخیوں کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔اختر ناول کے ابتدائی دور کا کردار ہے اور ثمن ترقی یافتہ دور کا لیکن دونوں کردار کہیں نہ کہیں حالات کے ہاتھوں مجبور ہیں۔اختر کو سماجی مسائل کا سامنا تعلیم کے لیے کرنا پڑا تو ثمن کا جینا معاشرے کے رنگ و نسل سے متعلق تعصبات نے دوبھر کر دیا۔ایک طرف ایک عورت کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے حالات کا سامنا کر کے انھیں سہنا پڑتا ہے تو دوسری طرف عورت اپنے مقصد کے حصول کے لیے بغاوت کا راستہ اختیار کرتی ہے۔معاشرہ کبھی بھی عورت کو آسانی سے مقصد کا حصول نہیں کرنے دیتا۔شاید یہ جستجو ازل سے ہی اس کا مقدر ہے۔

زیر نظر تحقیق سے آئندہ آنے والے محققین،اردو ادب میں نسائی کرداروں کے ارتقا اور اردو ادب میں تصور عورت کی پیشکش سے واقف ہو سکیں گے اور کسی حد تک معاشرے کے نسائی رویوں پر پڑنے والے اثرات سے بھی آگاہ ہو سکیں گے۔اردو ادب کے ابتدائی دور کی ناول نگار خاتون نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النسا بیگم اور ترقی یافتہ دور کی مصنفہ عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کے ارتقا کا جائزہ فرداً فرداً لے کر تقابلی تجزیہ کیا گیا ہے۔آئندہ تحقیق میں اس دور کی خواتین اور مرد مصنفین کی تحریروں کے تقابلی مطالعے سے نسائی کرداروں کے ارتقا کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔تاکہ مرد اور عورت دونوں طرح کے مصنفین کے تصور عورت کا احاطہ کیا جا سکے۔یہ بھی ایک تحقیق طلب پہلو ہو سکتا ہے کہ مرد مصنفین نے نسائی کرداروں کی پیشکش کس انداز میں کی ہے اور خواتین قلم کاروں نے نسائی رویوں کو کس طرح سے پیش کیا ہے۔

کتابیات

کتابیات

احمد، شمیم۔"ناول نگاری کا غالب رجحان"۔ تخلیقی ادب (جلد دوم)۔کراچی: عصری مطبوعات،۱۹۸۰۔

احمد، ڈپٹی نذیر۔کلیات ڈپٹی نذیر احمد،مراۃ العروس۔لاہور: جمیل پرنٹنگ پریس،۲۰۰۵

اختر، جاوید۔اردو کی ناول نگار خواتین:ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۷۔

اختر، سلیم۔داستان اور ناول۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱۔

اشرف، خالد۔برصغیر میں اردو ناول۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۴۔

اشفاق، حمیرا۔جدید اردو فکشن:عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات۔لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۰۔

اعظمی، انجم السحر۔علامہ راشد الخیری :شخصیت اور ادبی خدمات۔دہلی: ادارہ بزم خضر راہ،۲۰۰۰۔

آرا، نسیم۔اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ۔پاکستان: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۸۔

بٹ، افضال۔اردو ناول میں سماجی شعور۔اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹۔

بخاری، سہیل۔اردو ناول نگاری۔دہلی: الحمرا،۱۹۸۶۔

بخش، سلطانہ۔پاکستانی اہل قلم خواتین:ایک جائزہ۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۳۔

بخش، سلطانہ(مرتب) ۔عصمت چغتائی شخصیت اور فن۔اسلام آباد: ورڈ ویژن پبلشرز،۱۹۹۲۔

بخش، سلطانہ۔پاکستانی ا ہل قلم خواتین۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۳۔

بیگم، طاہرہ۔افسانہ نادر جہاں(حصہ دوم)۔لکھنو: مطبع نول کشور،۱۹۱۸۔

پراچہ، احمد۔پاکستانی اردو ادب اورا ہل قلم خواتین۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۰۔

تابیتا، پریا۔اردو ناول کے منفی کردار:آغاز تا قیام پاکستان۔لاہور: خرم بکس،۲۰۰۶۔

جاوید، عقیلہ۔اردو ناول میں تانیثیت۔ملتان: بہاالدین زکریا یونی ورسٹی،۲۰۰۵۔

چغتائی،عصمت۔ ٹیڑھی لکیر۔لاہور:مکتبہ اردو،۲۰۰۱۔

حیدر،سید علی۔اردو ناول سمت و رفتار۔الہ آباد:شبستان،۱۹۷۷۔

حسینی،علی عباس۔ناول کی تاریخ و تنقید۔لاہور:لاہور اکیڈمی ۱۹۶۴۔

حنا،زاہدہ۔"رشندری،رشیدہ اور رقیہ کا خواب"۔اصلاح النسا از رشیدۃ النسا۔پٹنہ:خدا بخش اورینٹل لائبریری،۲۰۰۷۔

حنفی،شمیم۔"عصمت کی ٹیڑھی لکیر"۔عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر۔مرتبہ ڈاکٹر جمیل اختر۔دہلی:انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن،۲۰۰۱۔

حیدر،نذر سجاد۔مذہب اور عشق۔مرتبہ قرۃ العین حیدر۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۴۔

حیدر،نذر سجاد۔اختر النسا بیگم۔لاہور:دار الاشاعت پنجاب،۱۹۲۵۔

خان،مجیب احمد۔حجاب امتیاز علی :حیات اور کارنامے۔دہلی:تخلیق کار پبلی کیشنز،۱۹۹۶۔

خان،ممتاز احمد۔اردو ناول کے چند اہم زاویے۔پاکستان:انجمن اردو،۲۰۰۳۔

خان،ممتاز احمد۔آزادی کے بعد اردو ناول:ہئیت،اسالیب،رجحانات۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۲۰۰۸۔

خان،ممتاز احمد۔اردو ناول کے بدلتے تناظر۔اردو اکیڈمی،سن ندارد۔

رضوی،شبنم۔عصمت چغتائی کی ناول نگاری ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں۔دہلی:نیو پبلک پریس،۱۹۹۲۔

رئیس،قمر۔تعبیر و تحلیل۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۶۔

رئیس،قمر۔رتن ناتھ سرشار:ہندوستانی ادب کے معمار۔دہلی:ساہتیہ اکیڈمی،۱۹۹۶۔

ریاض،ترنم(مرتب)۔بیسویں صدی میں خواتین کا ادب۔دہلی:ساہتیہ اکادمی،۲۰۰۴۔

ریاض،فہمیدہ۔ادب کی نسائی رد تشکیل۔کراچی:وعدہ کتاب گھر،۲۰۰۶۔

سعید،حمیرا۔اردو ناولوں میں نسائی حسیت۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۹۔

شیخ،اقرار حسین۔اردو ادب کے شاہکار ناول۔اسلام آباد:دی بکس،۲۰۱۱۔

https://ur.wikipedia.org/wiki/جہیز,Saturday, April 29, 2017,7:15 pm

شرر،عبدالحلیم۔بدر النسا کی مصیبت۔بمبئی:مکتبہ سلطانی،۱۹۰۱۔

صدیقی،ابوالاعجاز حفیظ۔کشاف تنقیدی اصطلاحات۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵۔

صدیقی،شاہد۔*Language, Gender, and Power*۔کراچی:آکسفورڈ یونیورسٹی پریس،۲۰۱۴۔

صدیقی، صالحہ(مرتب)۔اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۴۔

صدیقی، عظیم الشان۔اردو ناول کا آغاز و ارتقا:۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۸۔

عابد، قاضی(مرتب)۔اردو ادب اور تانیثیت:منتخب مضامین۔اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱٦۔

عبدالسلام۔اردو ناول بیسویں صدی میں۔کراچی:اردو اکیڈمی،۱۹۷۳۔

عبدالسلام۔حسرت،عبدالحق۔عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول۔دہلی:اعجاز پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۹۔

عزیز احمد۔"عصمت کی ٹیڑھی لکیر"۔عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر۔مرتبہ اختر، جمیل۔نئی دہلی:انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن،۲۰۰۱۔

عظیم، وقار۔داستان سے افسانے تک۔کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹٦۰۔

غزنوی، خاطر۔جدید اردو ادب۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۵۔

فاروقی، احسن۔ادبی تخلیق اور ناول۔کراچی:مکتبہ اسلوب،۱۹٦۳۔

فاروقی، احسن۔اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔لکھنؤ:ادارہ فروغ اردو،۱۹۷۳۔

فرزانہ، نیلم۔اردو ادب کی خواتین ناول نگار۔لاہور:فکشن ہاؤس ۱۹۹۲۔

فضل، سیمیں ثمر۔ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ۔دہلی:اے ون فوٹو سٹیٹ،۱۹۹۱۔

کبیر، فہمیدہ۔اردو ناول میں عورت کا تصور۔نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۹۲۔

کشش، عبدالخلیل۔"ناول نگاری کے ارتقامیں خواتین کا حصہ"۔روزنامہ سیاست:حیدرآباد،۲۵ اپریل ۲۰۱۵urdu.siasat.com/news/750581./.15.10.2017,11:15am.

کھلر، کے۔کے۔اردو ناول کا نگار خانہ۔دہلی:سیمانت پرکاش،س ن۔

ماہنامہ اردو دنیا۔اگست ۲۰۱۵ء۔جلد ۱۷،شمارہ ۰۸۔دہلی۔

مجتبیٰ، حسین۔اردو ناول کا ارتقا۔دہلی:پرویز بک ڈپو،۱۹۷۴۔

مرزا، ہمایوں صغرا۔سرگزشت ہاجرہ۔حیدرآباد،۱۹۲٦۔

مظہر، نعیم۔اسلم، فوزیہ۔اردو ناول:تفہیم و تعبیر۔پاکستان:ادارہ فروغ قومی زبان،۲۰۱۲۔

مظہر،شعیب۔"اردو کی پہلی ناول نگار خاتون"۔مشمولہ مجلہ نقوش شمارہ۱۱۵۔لاہور۔

نارنگ، گوپی چند۔بیسویں صدی میں اردو ادب۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز۔

نگار، سنبل۔اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔لاہور:دارالنوادر، ۲۰۱۳۔

ودھاون، جگدیش چندر۔عصمت چغتائی شخصیت اور فن۔نئی دہلی:مہرہ آفیسٹ پریس، سن ندارد۔

یوسف، سرمست۔بیسویں صدی میں اردو ناول۔حیدر آباد:نیشنل بک ڈپو، ۱۹۷۳۔

International Islamic
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD

معظم، شعیب۔ "اردو کی پہلی ناول نگار خاتون"۔ مشمولہ مجلہ نقوش شمارہ ۱۱۵۔ لاہور۔

نارنگ، گوپی چند۔ بیسویں صدی میں اردو ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔

نگار، سنبل۔ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۳۔

ودھاون، جگدیش چندر۔ عصمت چغتائی شخصیت اور فن۔ نئی دہلی: مہرہ آفیسٹ پریس، سن ندارد۔

یوسف، سرمست۔ بیسویں صدی میں اردو ناول۔ حیدرآباد: نیشنل بک ڈپو، ۱۹۷۳۔

International Islamic University
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD.